184 ob. 9? /
Jangal men Mangal
by
Zafar Ali Khan

جنگل میں منگل

مصنفہ

رڈیارڈ کپلنگ

جسکو

بہ تعمیل ارشاد ملازمان

عالیجناب معلّے القاب نواب سر وقار الامرا بہادر کے۔سی۔آئی۔ای

وزیر اعظم دولت آصفیہ دام اقبالہم

ظفر علی خاں بی۔ اے

نے اُردو میں ترجمہ کیا

باہتمام راجہ غلام قادر خاں منیجر و پرنٹر

مسلم پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپی

عبد القادر

The Jungle Book

دیباچہ مترجم

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

جس فطرت پر انسان پیدا کیا گیا ہے اُس کا یہ تقاضا ہے کہ دنیا کی کُل چیزوں کو تشبیہ اور تمثیل کے واسطے سے پہچانا جائے۔ دائرۂ قدرت کے اندر کوئی شے خواہ کیسی ہی عجیب اور نرالی کیوں نہ ہو لیکن ہم اُس میں اور دوسری اشیا میں جو ہمارے احاطۂ علم میں ہیں کوئی نہ کوئی مشابہت یا مماثلت ضرور پاتے ہیں۔ اِن مشابہتوں اور مماثلتوں کی جستجو کرنے میں ذہن کو ایسی ہی خوشی حاصل ہوتی ہے جیسی کہ بچوں کو آنکھ مچولی کھیلنے میں۔ شعر و سخن اور بذلہ سنجی و ظرافت کے لطف کے اکثر حصہ کا ماخذ یہی تشبیہیں اور تمثیلیں ہیں اور فصاحت و بلاغت کا سحر زا اثر انہیں کی بدولت نشو و نما پاتا ہے۔ اِس کے علاوہ ہم جن چیزوں کو آسانی سے تصور میں نہیں لا سکتے اُن کے سمجھنے میں تشبیہوں اور تمثیلوں کی مدد سے ہم کو بہت کچھ سہولیت ہو جاتی ہے اور اپنے قیاسات پر زیادہ اطمینان ہو جاتا ہے عربی کی اِس مشہور ضرب المثل کا کہ المرءِ یقیس علیٰ نفسہٖ عام طور پر یہی مطلب

ہے۔ جب ہم خیال کرتے ہیں کہ سیّارۂ جو پطر زمین کی طرح اپنے محور کے گرد گھومتا ہے اور سورج کے گرد گردش کرتا ہے اور جس طرح زمین کو چاند روشنی پہنچاتا ہے اسی طرح اس کو روشن کرنے کے لئے بھی متعدد سیّارے چاند کی طرح موجود ہیں تو ہم اِس مشابہت اور مماثلت کی بنا پر یہ قیاس دوڑاتے ہیں کہ جب اِن حالتوں میں زمین میں انواع واقسام کے حیوانات کی زندگی کے برقرار رکھنے کی استعداد موجود ہے تو سیّارۂ جو پطر میں بھی اسی طرح کی حالتوں کے موجود ہونے کے باعث حیوانات کا سکونت پذیر ہونا ممکن ہے۔

غرضکہ مشبّہ اور مشبّہ بہ میں جس قدر قریب کی مماثلت ہو گی اُسی قدر ہمارا یقین ہمارے قیاس پر زیادہ غالب آئے گا اور اُسی نسبت سے ہم کو اُس میں دلچسپی ہوگی۔

انسان کی زندگی پر جب سے کہ تاریخ نے تمدّن اور شایستگی کی روشنی ڈالی ہے ہم برابر دیکھتے چلے آئے ہیں کہ ہر قوم نے ہر زمانہ میں جانوروں کے حالات دریافت کرنے میں نہایت شوق اور دلچسپی ظاہر کی ہے جہاں تک مشاہدہ اور تجربہ کی مدد سے جو حقیقتِ اشیا کے معلوم ہونے کا ایک دوسرا صحیح لیکن روکا پھیکا ذریعہ ہے جانوروں کے حالات معلوم ہو سکے وہ بہت سی علمی کتابوں میں مدوّن ہو چکے ہیں اور اُن کا ایک نادر ذخیرہ زمانۂ حال کے کتب خانوں میں موجود ہے لیکن جانوروں میں اظہار خیالات کے اُس زبردست واسطے یعنی قوت گویائی کے نہ ہونے کے باعث جس کے ذریعہ سے انسان ترقی کی اس منزل پر پہنچا ہے اور جو اس میں اور ان میں بمنزلہ ایک حدِّ فاصل کے ہے جانوروں کی اندرونی زندگی کی حقیقت پر ایک ایسا تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے جس کو تحیّر اُٹھانا چاہتا ہے لیکن نہیں اُٹھا سکتا۔ اِس پر اگر کوئی

روشنی پڑ سکتی ہے تو اُسی تشبیہ و تمثیل کی جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ چونکہ ترکیب جسمانی کے لحاظ سے جانوروں میں اور ہم میں بہت قریب کی مشابہت ہے اس لئے ضرور ہے کہ استدلال تخیل اور تصور کی جدوجہد جو ہمارے دماغوں میں مسلسل جاری رہتی ہے اُن میں بھی اپنے بساط کے موافق موجود ہو۔ جس طرح زندگی کی خوشیاں۔ دلوں کی امنگیں۔ ارادوں کے چاؤ ہم میں پائے جاتے ہیں اُن میں بھی ہوں۔ جس طرح ہم اپنے دوستوں سے ملتے جُلتے ہیں اور اپنے خیالات اپنی زبان میں ایک دوسرے پر ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ بھی کریں گو کہ اُن کی بولی ہم سمجھ نہ سکتے ہوں۔

پس ایسی حالت میں اصول متذکرہ بالا لازم آتا ہے اور ہم اپنے آپ کو اُن کا مشبہ بہ قرار دیکر اُن کے جذبات واحساسات اندرونی اور اُن کی معاشرت ظاہری کی تحقیق کے متعلق جس پر ہمارے ملکۂ تحیر کو اصرار رہے اپنی حالت کو اُن کی حالت کا مقیاس ٹھہراتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہمارا یہ بھی خاصہ ہے کہ ہم کیفیات ظاہری سے جنکے مورد ہم خود ہوں باطناً اتنے زیادہ متاثر نہیں ہوتے جتنے کہ اُس حالت میں ہوتے ہیں جبکہ اُنھیں کیفیات کا مہبط ایک دوسرا شخص ہوتا اور ہم اُس کی حالت کو معاینہ کرتے۔ احتیاط اور پیش بندی کا اصول جس پر زندگی کی کامیابی کا دارومدار ہے اپنے دوسرے ابنائے جنس ہی کی حالت کو دیکھکر عبرت کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ اثر چھپکے چھپکے ہوتا ہے لیکن اُن لوگوں کے دلوں میں جن کی چشم بصیرت کھلی ہو بتدریج اس طرح سرایت کر جاتا ہے کہ پھر زائل نہیں ہوتا۔ نصیحت کا کوئی طریقہ ایسا دل آویز

اور دل پذیر نہیں جیسا کہ جانوروں کو انسانی عادات خصائل و خیالات کا لباس پہنا کر اُن کی زبانی ایک دلچسپ حکایت کے ضمن میں ایسے اخلاقی نکتوں کا اظہار کرنا جن پر عمل پیرا ہونا انسان کے لئے ازبس مفید ہو۔ قدیم ہندوؤں اور یونانیوں نے اس جادو کو خوب سمجھا تھا۔ یہاں تک کہ ہندوؤں میں وہ تناسخ کی شکل میں نمودار ہوا۔ اور فرقۂ بدھ کی تمام کتابیں جن کو جاتکا کہتے ہیں اسی طرز میں لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ "کلیلہ و دمنہ" اور "فسانہ ہائے ایسپ" (جس کا ترجمہ اردو میں شمس العلما ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی دہلوی نے نہایت خوبی سے حکایات لقمان کے نام سے کیا ہے) اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

کچھ انہیں خیالات کی بنا پر جب حال میں عالی جناب معلی القاب نواب محمد فضل الدین خاں سکندر جنگ اقبال الدولہ اقتدار الملک سر وقار الامراء بہادر کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ وزیر اعظم دولت آصفیہ نے جن کی ذات بابرکات ایک بیدار مغز اور روشن خیال مدبر ہونے کے علاوہ اشاعت علوم و فنون کی بہت بڑی سرپرست ہے اور جن کی قدردانی فضل و ہنر اردو زبان میں متعدد مفید اور عمدہ کتابوں کے لکھے جانے کا باعث ہوئی ہے اپنے فضیلت مآب سکرٹری جناب مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی۔ اے ممبر آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی وساطت سے جن کی کرم آمیز عنایت ہمیشہ میرے شامل حال رہی ہے مجھے حکم دیا کہ میں مسٹر رڈیارڈ کپلنگ کی کتاب "دی جنگل بک" کا ترجمہ اردو میں کروں تو میں نے نہایت خوشی اور شوق سے اس کام کو شروع کر دیا۔ کیونکہ اس سے نہ صرف عالی جناب نواب صاحب ممدوح کے ارشاد کی تعمیل منظور تھی بلکہ یہ خیال بھی ساتھ ہی میرے دل میں جاگزین تھا کہ عالی جناب موصوف کے مذاق سلیم نے جس کتاب کو ترجمہ کے لئے منتخب فرمایا ہے

اُس کے ترجمہ سے اُردو لٹریچر میں ایک مفید اضافہ ہو جائیگا۔

ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں میں کم ایسے ہوں گے جو مسٹر ڈیارڈ کپلنگ کے نام سے آشنا نہ ہوں۔ مسٹر موصوف زمانۂ حال کے ایک بہت بڑے مصنف ہیں اور اُن کا شمار اُن ادیبوں میں ہوتا ہے جنہیں یکتائی کا تمغہ مل چکا ہے۔ میدان شہرت میں قدم رکھے ہوئے اُنہیں زیادہ عرصہ نہیں گذرا وہ ابھی ایک نوعمر شخص ہیں اور چند سال قبل لاہور کے روزانہ انگریزی اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کے سب ایڈیٹر اور اُس کے بعد اخبار پایونیر الہ آباد کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے اُس وقت وہ چنداں مشہور نہ تھے لیکن اس تھوڑے سے عرصہ میں وہ فن تصنیف و تالیف میں درجۂ کمال کو پہنچ گئے۔ یورپ اور امریکہ میں اُنکی جادو نگاری کی دھاک بندھ گئی ہے۔ اُن کی کتابیں ایسی مقبول اور اُن کا طرز تحریر ایسا عام پسند ہے کہ اُن کا نام بھی اُسی طبقہ کے لوگوں میں لیا جانے لگا ہی جس میں ہومر، شکسپیر، ملٹن، ڈینٹی اور گیتھی داخل ہیں۔ پچھلے دنوں جب وہ بیمار پڑ گئے تھے تو امریکہ سے انگلستان تک اُن کی عیادت کے تاروں کا ایک سلسلہ بندھ گیا تھا اور لوگ کہتے تھے کہ رڈیارڈ کپلنگ کا دنیا سے اُٹھ جانا ایک جاں گزا قومی حادثہ سے کم نہ ہوگا۔

”جنگل میں منگل“ جو اِس کتاب کے ترجمہ کا نام ہے گویا اردو زبان میں ایک دوسری چھوٹی سی نئے طرز کی انوار سہیلی ہے۔ یہ نام شاید مشکل پسند طبیعتوں کو اچھا نہ معلوم ہو اور میرے ایک کرم فرمانے اس نام پر یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ اس کو سُن کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کوئی ناٹک کی کتاب ہے۔ لیکن اول تو ناٹک میرے نزدیک فی نفسہٖ کوئی بُری چیز نہیں اور دوسرے میں یہ نہیں چاہتا کہ ایک ایسی کتاب کو جس میں وحوش و طیور کے حالات ہیں اور

جس کے موجودہ نام سے اُس کا موضوع ایک حد تک ظاہر ہوتا ہے "پرتوِ خورشید" یا "کوکبِ درخشاں" یا کسی اور اسی طرح کے نام سے موسوم کر کے

(پوچھیں زمین کی تو کہیں آسمان کی)

کا مصداق بنوں۔ "دی جنگل بک" کا ایک اور صحیح ترجمہ عربی میں "کتاب البادیہ" ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ بھی ثقل سے خالی نہیں اور اس لئے مجھے امید ہے کہ اکثر لوگ اسی نام یعنی "جنگل میں منگل" کو پسند کریں گے۔ اس کتاب میں جانوروں کے حالات دلچسپ اور دل آویز قصّے کہانیوں کی شکل میں مندرج ہیں اور ہر ایک قصّے سے ایسے ایسے اخلاقی نتائج ضمنی طور پر مترتب ہوتے ہیں جن پر کاربند ہو کر انسان بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ بچوں کو اس کتاب کے ساتھ خصوصیت سے رغبت ہوگی کیونکہ اُن کے طفلانہ جذبات و احساسات پر اس کے مطالعہ سے ایک خوش آیند اثر پڑے گا۔

میں نے اس کتاب کو جو قریب چار سو صفحے کے ہے ایک مہینہ سے کچھ زیادہ عرصہ میں ختم کیا ہے اور جب اس امر کو مدنظر رکھا جائے کہ رڈیارڈ کپلنگ کا طرزِ تحریر اس لحاظ سے کہ وہ بازاری محاوروں کو اعلیٰ درجہ کے روزمرہ کے ساتھ کمال خوش اسلوبی سے ملا دیتا ہے ایک نرالا رنگ لئے ہوئے ہے اور اس لئے اردو میں اُس کا وہی زور قایم رکھنا جو اصل انگریزی میں ہے ایک مشکل کام ہے تو مجھے امید پڑتی ہے کہ میرے ناظرین میری محنت اور جانفشانی کی داد دیں گے اور میری لغزشوں کو جن سے ایک ایسی ضخیم اور اس قدر قلیل مدت میں لکھی ہوئی کتاب پاک نہیں ہو سکتی نظر انداز کرینگے۔ فقط۔

ظفر علی خاں

حیدر آباد۔ دکن

۱۵ ر نومبر ۱۹۰۱ء

جنگل میں منگل



راجہ مینڈک کے بہن بھائی

چھا گئی صفحۂ گیتی پہ شبِ تیرہ و تار | سو گئے زاغ و زغن اور ہوا شپرہ ہشیار
گلے ڈھوروں کے سبھی بند ہوئے باڑوں میں | پو پھٹے تک عمل اپنا ہے کھلی اپنی مہار
زور و قوت کے دکھانے کی گھڑی آ پہنچی | ہو گئے ناخن و چنگال سے ہم بھی تیار
اے لو وہ شور ہوا دشت کے رہنے والو | آج کی رات میسر ہو تمہیں خوب شکار

(جنگلی درندوں کا رات کے وقت کا گیت)

سیانی کے کوہستان میں ایک دن جبکہ گرمی کا زور تھا شام کے سات بجے ایک بھیڑیا دن بھر کا سویا ہوا جاگا اور اپنے بدن کو کھجلا کر اور جمائی لیکر اُس نے اپنے پنجے ایک ایک کر کے پھیلائے تاکہ نیند کے جس خمار سے ابھی تک اُن کی نوکیں آلودہ تھیں وہ زائل ہو جائے اُس کی مادہ جس کے مٹیالے رنگ کی تھوتھنی معمول سے زیادہ نمایاں تھی اپنے چار بچوں کو جو چیختے ہوئے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے لئے پڑی تھی اور جس غار میں یہ سب رہتے

تھے اُس میں چاندنی اپنی جھلک دکھا رہی تھی بھیڑیے نے غرا کر اپنی مادہ سے کہا کہ اُٹھو شکار کا وقت پھر آگیا اور یہ کہ کر وہ دامن کوہ کی طرف قلانچ بھرنے ہی کو تھا کہ ایک چھوٹا سا جانور جس کی دُم گپھے دار تھی غار کے مُنہ پر نمودار ہوا اور عاجزی کے ساتھ پکارا کہ اے بھیڑیوں کے سردار اقبال حضور کے ساتھ ہو اور حضور کے بچوں کی قسمت یاور اور اُن کے دانت تیز اور سفید ہوں تاکہ وہ اس دنیا میں بھوکوں کو نہ بھولیں۔

یہ جانور گیدڑ تھا اور اس لحاظ سے کہ وہ جنگل کے دوسرے شکاری سرداروں کا ذلّہ ربا ہے اُسے طباقی یعنی کابی کے صاف کرنے والا کہتے ہیں۔ ہندوستان کے بھیڑیوں کو طباقی سے نفرت ہے کیونکہ وہ طرح طرح کی شرارتیں کرتا ہے۔ ایک کی بات دوسرے سے جا لگاتا ہے۔ اور گاؤں کے کوڑے میں سے چیتھڑے اور چمڑے کے ٹکڑے نکال نکال کر کھاتا ہے لیکن وہ اُس سے ڈرتے بھی ہیں۔ کیونکہ طباقی بسا اوقات پاگل ہو جاتا ہے۔ اور جب اُس پر یہ حالت طاری ہوتی ہے تو وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ مجھے کبھی کسی کا خوف تھا۔ اس حالت میں وہ جنگل میں دوڑتا پھرتا ہے اور جو چیز اُس کے رستہ میں آتی ہے اُسے کاٹ کھاتا ہے۔ طباقی جب دیوانہ ہو جاتا ہے تو شیر کو بھی بھاگتے ہی بن پڑتی ہے اور وہ ڈر کے مارے کہیں جا چھپتا ہے۔ واقع میں ایک وحشی جانور کے لئے دیوانہ ہو جانا نہایت ہی معیوب اور بدنما بات ہے۔ ہم اس حالت کو خوف آب سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر وہ اس کو دیوانگی بتاتے ہیں اور خائف ہو کر بھاگ جاتے ہیں۔

غرضکہ بھیڑیے نے کرختگی کے ساتھ جواب دیا "اندر آکر دیکھ لے کھانا تو یہاں کچھ ہے نہیں"

طباقی نے کہا "حقیقت میں ایک بھیڑیے کے واسطے تو کھانا نہ ہو گا مگر میرے جیسے ادنیٰ حیثیت والے کے لئے ایک سوکھی ہڈی بھی نعمت ہے۔ بھلا ہم بیچارے گیدڑوں کا یہ دماغ کہاں کہ کھانے کے متعلق یہ کہیں کہ "نہ تو یہ چاہئے وہ چاہئے" یہ کہہ کر وہ

غار کے پیچھے کے حصہ کی طرف گیا جہاں اُسے ایک ہرن کی ہڈی جسپر کچھ گوشت لگا ہوا تھا۔ ملی۔ اس ہڈی کو وہ بیٹھ کر ذوق و شوق سے نوچنے لگا اور جب کھا چکا تو ہونٹ چاٹ کر بولا "اس مزیدار ضیافت کا شکریہ قبول فرمائیے۔ آپ کے بچے کیا ہی پیارے ہیں۔ انکی آنکھیں کیسی بڑی بڑی ہیں۔ اور اتنے سے سن پر ان کی یہ توانائی اور تنومندی۔ میرا حافظہ بھی کیسا خراب ہے مجھے یہ بات یاد ہونی چاہیے تھی کہ بادشاہوں کے بچے پیدا ہوتے ہی جوان ہوتے ہیں۔"

طباقی اِس بات کو خوب جانتا تھا کہ بچوں کے لئے اس سے بڑھی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اُن کے مُنہ پر اُن کی تعریف کی جائے اور وہ دل میں بڑا خوش ہوا جب اُس نے دیکھا کہ بھیڑیے اور اُس کی مادہ کو اُس کی اس حرکت سے بڑی تشویش پیدا ہوئی ہے جو شرارت کہ اُس نے کی تھی اُس پر وہ دل ہی دل میں بیٹھا ہوا خوش ہو رہا تھا اور جب کچھ دیر گزر چکی تو اُس نے بھیڑیے سے اس طرح پر خطاب کیا۔

"بڑے سردار شیر خان نے اپنی شکار گاہ کو بدل دیا ہے اُس نے مجھ سے یہ بات کہی تھی کہ اِس مہینے میں اِن پہاڑیوں میں شکار کرونگا۔"

شیر خاں اُس شیر کا نام تھا جو بیس میل کے فاصلہ پر دریائے وین گنگا کے کنارے رہتا تھا۔ بھیڑیے نے جب یہ بات سُنی تو خفا ہو کر بولا "اُسے ہرگز یہ حق حاصل نہیں جنگل کے قانون کی رو سے اُسے اِس بات کا استحقاق نہیں کہ دوسروں کو اطلاع دئے بغیر اپنے مقام سکونت کو بدل دے۔ اِس طرح تو دس میل کے اندر اندر جتنے جانور ہیں وہ سب کو چوکنا کر دے گا۔ اور مجھے ان دنوں اپنے لئے ہی نہیں بلکہ ایک دو کے لئے بھی شکار مار کر لانا ہے۔"

اِس پر بھیڑئے کی مادہ نے آہستہ سے کہا

"شیر خاں کی ماں نے جو اُس کا نام لنگڑا رکھا ہے وہ بے وجہ نہیں رکھا۔ پیدائش ہی سے اُس کے ایک پاؤں میں لنگ ہے اور یہی باعث ہے کہ وہ گایوں بھینسوں پر ہاتھ

صاف کرتا ہے۔ اب چونکہ وین گنگا کے گانوں والے اُس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے ہیں۔ اِس لئے وہ یہاں آگیا ہے تاکہ جس گاؤں کے قریب ہم رہتے ہیں اُس کے باشندے بھی ناراض ہو جائیں۔ گانوں والے اب اُس کی تلاش میں آکر جنگل چھان ماریں گے۔ مگر وہ تو کہیں دور براج رہا ہوگا۔ اور ہمیں اور ہمارے بچوں کو بھاگنا پڑیگا۔ شیر خاں نے ہم پر بڑا احسان کیا۔ ہم حقیقت میں اُس کے بڑے ممنون ہیں۔"

طباقی۔ "کیا میں آپ لوگوں کی ممنونیت کا حال جا کر اُس سے کہدوں۔"

بھیڑیا۔ (غرّا کر) "دور ہو مردود۔ چل یہاں سے نکل اور اپنے آقا کے ساتھ جا کر شکار کر۔ تو نے پہلے ہی کیا کچھ کم ضرر پہنچایا ہے جو اب ہم کو اس ہنر مرکشی کی دھمکی دیتا ہے۔"

طباقی (مسکین بن کر) "بہت خوب میں جاتا ہوں آپ ذرا کان لگائیں تو شیر خاں کے دھاڑنے کی آواز نیچے کی جھاڑیوں میں سن سکیں گے۔ مجھے اس پیغام لانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ شیر خاں کی گرج نے خود اُس کا پیغام سُنا دیا۔"

پہاڑی کے نیچے وادی میں ایک ندی جوش و خروش کے ساتھ یہ ترانہ گاتی ہوئی بہہ رہی تھی۔

ندی کا راگ

بگلوں اور چہوں کے نشیمن سے میں نکل کر ناگاہاں   چشم زدن میں سیلِ بلا کی طرح جھپٹ کر آتی ہوں
سبزہ کے فرشِ استبرق پر مثلِ دُرارتی غلطاں   کروٹیں لیتی ہوئی وادی میں پہنچکر شور مچاتی ہوں
کتنی گھاٹیوں کے دامن کو راہ میں آتی جھٹک کر میں   کتنے ٹیکروں اور ٹیلوں کے تلوے میں سہلاتی ہوں

نوٹ:- یہ نظم ٹینی سن کی ایک مشہور انگریزی نظم کا ترجمہ ہے جو میں نے کیا ہے۔ کپلنگ کی تصنیف میں اس کا پیوند لگانے سے مجھپر تصرف کا الزام ضرور عائد ہوگا۔ مگر مجھے امید ہے کہ جو لطف اسکے مطالعہ سے ناظرین کو حاصل ہوگا اُس سے اس الزام کی کسی قدر تلافی ہو جائے گی۔

ظفر علیخاں۔ بی۔ اے

بیسیوں گاؤں کے اور قصبوں کے پہلو سے نکلی ٹھنک کر میں
زید کے کھیت کے نیچے بہ کر تھوڑی سی دور پہ آخر کار
عمرو و زید کی ہستی ہی کیا ہے صبح آئے گئے شام ہائے
تان کھرج کی یا پنچم کی چھیڑتی ہوں بیخود ہو کر
پاؤں میں جھانجھ بھنور کی پہنے اوڑھے لطافت کی چادر
بنکر میں مشاطہ کبھی الجھاتی ہوں گیسوئے ساحل کو
اور کبھی ساقی بن کے مرتّب کرتی ہوں سبزے کی محفل کو
گاتی بجاتی جشن مناتی تھوڑی سی دور پہ آخرِ کار
عمرو و زید کی ہستی ہی کیا ہے صبح آئے گئے شام سدا ہا
زیب بدن میں کر کے آبِ رواں کا پاک اور صاف لباس
اپنے آنچل میں بھر لاتی ہوں ہیں کہیں پھول اور کہیں گھاس
کف کے عنبریں رنگ کے گالے مجھ پہ کہیں ہیں تیر رہے
لوٹتے لوٹتے رستہ میں بستر پہ سنہری کنکروں کے
بہتی بہتی بس اس انداز سے تھوڑی سی دور پہ آخر کار
عمرو و زید کی ہستی ہی کیا ہے صبح آئے گئے شام سدا ہا
اڑتی ابابیلوں کے ساتھ اڑاتی اپنی زیر و بم
سورج کی کرنوں کو اپنے ریت کے ٹاپوؤں پر پیہم
دشت نوردی بادیہ گردی کرتی اک انداز سے میں
لالہ و سنبل کو جو مظاہر عاشق اور معشوق کے ہیں
جھاڑوں میں جھنکاڑوں میں صحراؤں میں ویرانوں میں سدا
اپنے ریت کے بینڈوں میں کچھ دیر کو لیتی ہوں میں سستا

سینکڑوں پل ہیں میٹھی ہیں دل جنکا میں چرا کر لاتی ہوں
جا کے چھلکتے دریا کو میں شربت وصل پلاتی ہوں
مجھکو دیکھو ایک روش پر صبح و مسا چلی جاتی ہوں
ریزہ سنگ پہ تارِ آب پہ دلکش رحمتہ لگاتی ہوں
چھم چھم کرتی ہوئی آپ اپنے حسن پہ میں اتراتی ہوں
کھیتوں کا دھلواتی ہوں منہ میدانوں کو نہلاتی ہوں
ساغر نامیہ بھر کے بنفشہ اور سمن کو پلاتی ہوں
جا کے چھلکتے دریا کو میں شربت وصل پلاتی ہوں
مجھکو دیکھو کہ ایک روش پر صبح و مسا چلی جاتی ہوں
ساحت ہاموں پر ہر دم بل کھاتی ہوئی اٹھلاتی ہوں
گودیوں میں رہرو کو کبھی جھینگے کو کبھی میں کھلاتی ہوں
مارتی ہوں میں حباب کو گاہے اور کبھی اسکو جلاتی ہوں
ہیں ٹکرا کے کسی پتھر سے روپہلی چھینٹیں اڑاتی ہوں
جا کے چھلکتے دریا کو میں شربت وصل پلاتی ہوں
مجھکو دیکھو کہ ایک روش پر صبح و مسا چلی جاتی ہوں
ہیں کبھی پھسلی اور کبھی رپٹی اور کبھی آنکھ لڑاتی ہوں
رقص میں لا کر زہرہ کو افلاک پہ میں شرماتی ہوں
سبزۂ تر کو چھیڑتی ہوں اور بیدوں میں لہراتی ہوں
میٹھی نیند سے گدگدی لیکر چلتے چلتے جگاتی ہوں
چاند کو اور تاروں کو میں اپنا میٹھا راگ سناتی ہوں
اپنے کنارہ کی بوٹیوں سے دم بھر کو میں دل بہلاتی ہوں

کاٹتی ہوں اک چکر پھر اور تھوڑی سی دور پہ آخر کار جا کے چھلکتے دریا کو میں شربت وصل پلاتی ہوں

عمرو و زید کی ہستی ہی کیا ہے صبح آئے گئے شام سدھارے
مجھکو دیکھو کہ ایک روش پر صبح و مسا چلی جاتی ہوں

بھیڑیئے نے سُنا تو ندی کے شور کے ساتھ واقعی اُسے ایک شیر کے غصہ سے غرّانے کی آواز سُنائی دی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے شکار کچھ نہیں ملا خواہ تمام جنگل اُس کی آواز سُن لے پھر بھی اُسے کوئی پروا نہیں۔

اسپر بھیڑیا بولا "کیا گدھا ہے۔ شکار کرنے نکلا ہے اور اس قدر شور مچاتا ہے کیا وہ سمجھتا ہے کہ ہمارے یہاں کے ہرن بھی وین گنگا کے موٹے تازے بیلوں کی طرح ہیں"

بھیڑیے کی مادہ نے جواب میں کہا "آج کی رات نہ وہ بیل کا شکار کرنا چاہتا ہے نہ ہرن کا بلکہ انسان کا"

شیر کی آواز سے اب جنگل گونج اُٹھا۔ یہ اُس قسم کی آواز تھی جسے سُن کر لکڑہارے اور کنجر جو کُھلے میدان میں سوتے ہیں بدحواس ہو جاتے ہیں۔ اور بعض دفعہ پریشانی کے عالم میں دوڑ کر خود شیر کے مُنہ میں چلے جاتے ہیں۔

بھیڑیے نے اپنے سفید دانت دکھا کر مادہ کو یہ جواب دیا "کیا تالابوں کے کنارہ پر کافی بھونرے اور مینڈک موجود نہیں جو شیر خاں انسان کو کھانا چاہتا ہے" اور وہ بھی ہمارے علاقہ میں"

جنگل کا قانون جس کے تمام قاعدے حجت موجہ پر مبنی ہیں۔ ہر ایک درندے کو سوائے اُس حالت کے جبکہ اُسے اپنے بچوں کو شکار مارنے کا سبق سکھانا ہو انسان کے مارنے سے منع کرتا ہے اور اس حالت میں بھی ضرور ہے کہ وہ درندہ اپنے غول یا گروہ کی شکار گاہ کی حدود سے باہر شکار کرے۔ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ آدمی کے مارنے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ زود دیر سفید رنگ والے انسان بندوقیں لئے ہاتھیوں پر سوار آئیں گے اور سیکڑوں بھوری رنگت والے انسان ڈھول ہوائیاں اور مشعلیں لئے اُن کے ہمراہ ہوں گے۔ اسوقت تمام جنگل کے رہنے والوں پر

آفت آئے گی۔ انسان کو نہ مارنے کی وجہ درندے آپس میں یہ بتاتے ہیں کہ چونکہ انسان تمام جانداروں میں سب سے زیادہ کم زور ہے اور اُس کے پاس بچاؤ کا کوئی ہتیار نہیں اس لئے اُس کو چھونا مقتضائے شجاعت نہیں۔ ایک اور وجہ بھی وہ بتاتے ہیں جو کہ صحیح بھی ہے اور وہ یہ کہ مردم خواری سے جسم کے بال جھڑ جاتے ہیں اور دانت گِر جاتے ہیں۔

شیر کے غرّانے کی آواز اب بلند ہو چلی اور انجام کار وہ زور سے چنگھاڑا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے کسی شے پر حملہ کیا ہے۔ تب شیر خاں نے ایک زور کی چیخ ماری۔ بھیڑئے کی مادہ نے کہا "لو اُسے شکار نہیں ملا۔ دیکھو تو کیا ہے"۔

بھیڑیا جست بھر کر کچھ دُور گیا اور اُس نے شیر خاں کو جھاڑیوں میں لڑکھڑاتے اور غصہ سے کچھ بڑبڑاتے سُنا۔ اپنی مادہ سے آکر اُس نے کہا۔

"ایسا احمق ہے کہ لکڑہاروں نے جو الاؤ روشن کر رکھا تھا اُس میں جا کودا اور اپنے پنجے جلا لئے۔ طباقی اُس کے ساتھ ساتھ ہے"

بھیڑئے کی مادہ نے ایک کان پھڑپھڑایا اور بولی "کوئی چیز پہاڑی پر آ رہی ہے تیار رہو"

گھنی جھاڑیوں کے پتّوں میں ذرا سا کھڑکا ہوا اور بھیڑیا اپنے پچھلے پنجوں کے بل جست بھرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس وقت اگر تم نے دیکھا ہوتا تو ایک نہایت ہی حیرت انگیز نظارہ تمہارے دیکھنے میں آیا ہوتا اور وہ یہ کہ بھیڑئے کا زقند بھرتے بھرتے اپنے تئیں روک لینا۔ بھیڑئے نے جست لگائی ہی تھی کہ اُس نے دیکھا کہ میں کس شے پر کودا ہوں اور تب اُس نے اپنے آپ کو روکنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چار یا پانچ فٹ بلند اوپر کو اُچھلا اور جہاں سے کودا تھا وہیں آ رہا۔ اپنی مادہ سے اُس نے کہا۔

"اجی یہ تو انسان ہے۔ ایک ننھا سا آدمی کا بچہ! دیکھو تو آ کر"

عین اُس کے مُقابل ایک پست شاخ کو تھامے ہوئے ایک ننگا گندمی رنگ کا بچہ جس نے ابھی ابھی چلنا سیکھا تھا کھڑا تھا۔ بیچاری ننھی سی جان بھٹک کر بھیڑئے کے غار

کی طرف چلی آئی تھی۔ بچہ نے بھیڑئے کو دیکھا اور مُسکرا دیا۔

بھیڑئے کی مادہ نے اپنے نر سے پوچھا "کیا آدمی کا بچہ ہے۔ مجھے کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اسے یہاں اُٹھا لاؤ"

جس بھیڑئیے کو اپنے پلوں کو ایک جگہہ سے اُٹھا کر دوسری جگہہ لیجانے کی مشق ہوتی ہے وہ اگر چاہے تو مُنہ میں انڈا لیجائے اور اُسے توڑے نہیں۔ بچہ کو پیٹھ پر سے اُٹھا کر اُس نے اپنے پلوں کے درمیان لاکر رکھ دیا اور اُس کی جلد کو ایک دانت تک کا خراش نہیں پہنچا۔

بھیڑئے کی مادہ نے ملائمت سے کہا "کیسا ننھا سا ہے۔ جسم پر اس کے بال تک نہیں اور دیکھو جری ایسا ہے کہ ڈرتا نہیں" (بچہ بھیڑئے کے پلوں کو ہٹا کر مادہ کی طرف رینگ رہا تھا تاکہ اُس کی گرم گرم کھال کے زیادہ قریب پہنچے) "او ہو اس نے تو دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر دودھ پینا شروع کر دیا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ بھیڑئے کے بچوں کے ساتھ آدمی کا بچہ پرورش پائے۔ کبھی اس سے پہلے بھی ایسا اتفاق ہوا ہے۔

بھیڑئے نے جواب دیا "میں نے سُنا تو ہے کہ کبھی کبھی ایسا اتفاق پیش آیا ہے۔ لیکن ہمارے غول میں کبھی کسی نے انسان کا بچہ نہیں پالا۔ اس کے جسم پر ایک رواں تک نہیں اور اپنے پنجہ سے اگر میں اسے چھو بھی دوں تو وہ مرجائے۔ مگر دیکھو وہ میرے چہرہ پر نگاہ جماتا ہے اور ڈرتا نہیں"

اس وقت غار میں بالکل اندھیرا چھا گیا کیونکہ شیر خاں نے اپنا مٹکا سا سر اور چوڑے چکلے کاندھے غار کے مُنہ میں داخل کئے تھے اور چاندنی کو آنے سے روک دیا تھا۔ طباقی اُس کے پیچھے کھڑا ہوا پکار رہا تھا "میرے آقا میرے ولی نعمت وہ اسی کے اندر گیا ہے"

بھیڑئے نے جس کی آنکھوں میں غصہ کی چمک تھی شیر کو دیکھکر کہا "شیر خاں نے ہمارے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرما کر ہماری بڑی عزت افزائی کی لیکن شیر خاں کا کس غرض سے

تشریف لانا ہوا۔

شیر خاں نے جواب دیا" میں اپنا شکار لینے آیا ہوں۔ ایک آدمی کا بچہ ادھر سے گذرا ہے۔ اُس کے ماں باپ بھاگ گئے۔ لاؤ اُسے میرے حوالے کرو۔"

بھیڑئے کی بات سچ تھی۔ شیر خاں لکڑہاروں کے الاؤ میں جا کودا تھا اور اُس نے اپنے پنجے جلا لئے تھے۔ درد کے مارے ہوقت اُس کے غصہ کی کوئی حد نہ تھی۔ لیکن بھیڑیا جانتا تھا کہ غار کا مُنہ اس قدر تنگ ہے کہ شیر اُس میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس وقت جہاں شیر خاں کھڑا تھا وہاں بھی اُس کے کندھے اور اگلے پنجے جگہہ کے فراخ نہ ہونے کے باعث اسیطرح بھینچے ہوئے تھے جس طرح ایک آدمی کے کندھوں کی حالت ہو جو ایک پیپے میں گھسکر لڑنا چاہے۔

چنانچہ بھیڑئے نے شیر کو یہ جواب دیا۔" بھیڑیوں کی قوم کو پوری آزادی حاصل ہے۔ وہ اگر کسی کا حکم سُن سکتے ہیں تو اپنے غول کے سردار کا۔ کسی دھاری دار بلے کو جس کا پیشہ مویشیوں کا خون کرنا ہو ہرگز یہ حق حاصل نہیں کہ اُن پر حکمرانی کرے۔ انسان کا بچہ ہمارا ہے ہم چاہیں گے تو اُسے ماریں گے۔"

شیر نے غضبناک ہو کر کہا" تم چاہو گے؟ چاہنے کی بھی تم نے ایک ہی کہی! قسم ہے اُس بیل کی جسے میں نے مارا ہے کہ میں اپنا حق مانگنے کے لئے تم کُتوں کے غار میں اس طرح پر ناک دئے ہوئے زیادہ انتظار نہیں کر سکتا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں میں ہوں شیر خاں۔

شیر کی چنگھاڑ سے غار دہل گیا۔ بھیڑئے کی مادہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر آگے کی طرف جھپٹی اور اُس کی آنکھیں جو اندھیرے میں اس طرح چمک رہی تھیں جیسے کہ دو سبز چاند۔ شیر خاں کی مشعل کی طرح جلتی ہوئی آنکھوں کے مقابل ہوئیں۔ اُس نے بھی شیر کو ترکی بہ ترکی یہ جواب دیا۔

"اور تو جانتا ہے کہ میں کون ہوں جو تجھے جواب دیتی ہوں۔ میرا نام ہے دیوی۔ آدمی کا

بچہ میرا ہے۔ لنگڑے تو کون ہوتا ہے اُس کو مارنے والا۔ اس آدمی زاد کو میں پالونگی۔ اور وہ ہمارے غول کے ساتھ دوڑے گا اور شکار کرے گا۔ اور دیکھ خبردار ہو جا اے ننھے بچوں کو مارنیوالے مینڈکوں کے کھانے والے۔ مچھلیوں کے ڈھکوسنے والے۔ آخر کار یہی بچہ بڑا ہو کر تیرا ٹیٹوا دبوچے گا۔ اب دور ہو یہاں سے ورنہ قسم ہے مجھکو اُسی سانبھر کی جسے میں نے مارا تھا (میں وہ نہیں کہ تیری طرح دُبلی گایوں بھینسوں کو زہر مار کیا کروں) کہ جتنا لنگڑا تو پیدا ہوا تھا اُس سے بھی زیادہ لنگڑا کر کے اے جلے پنجوں والے جنگلی بلے تجھے اپنی ماں کے پاس بھیجوں گی۔ چل نکل یہاں سے"

بھیڑیا متعجب ہو کر اپنی مادہ کے اِس جوش و خروش کو دیکھتا رہا۔ وہ اُن دنوں کو بھول گیا تھا جبکہ اُس نے اُسے پانچ بھیڑیوں سے لڑکر اپنی زوجیت کے لئے چھینا تھا اور جبکہ وہ غول میں شریک تھی اور اپنی تندی و خونخواری کے لحاظ سے دیونی کہلاتی تھی۔ شیر خاں بھیڑئے سے مقابلہ کر لیتا مگر وہ اُس کی مادہ سے نہیں لڑسکتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جہاں وہ کھڑی ہے وہاں اُسے ہر طرح سے غلبہ حاصل ہے اور وہ جان توڑ کر لڑے گی۔ غرض یہ سوچ کر وہ غراتا ہوا غار کے مُنہ سے ہٹ گیا اور باہر نکل کر پکارا۔

"اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے۔ ہم بھی دیکھیں گے کہ آدمی کے بچوں کے پالنے پر بھیڑیوں کا غول کیا کہتا ہے۔ یہ بچہ میرا ہے اور آخر کار یہ میرے ہی دانتوں کی نذر ہوگا۔ خبردار ہو جاؤ اے جھاڑی کے دُم والے چُوراچکو!"

بھیڑئے کی مادہ ہانپتی ہوئی اپنے بلوں میں آبیٹھی اور اُس کے نر نے نہایت سنجیدگی سے یوں کہا۔

"چلتی دفعہ شیر خاں جو بات کہہ گیا وہ صحیح تھی۔ اِس بچہ کو ہمیں ضرور غول کے سامنے پیش کرنا پڑے گا۔ کیا ابھی تک تم اِس بات پر آمادہ ہو کہ تم اُس کو اپنے بچوں کے ساتھ پالوگی؟"

مادہ نے اپنے نرکو تند ہو کر جواب دیا۔

"کیا تم کو اس میں شک بھی ہے؟ بیچارہ رات کے وقت یہاں بیکسی کی حالت میں ننگا اور بھوکا آیا۔ لیکن ڈرا نہیں۔ دیکھو اُس نے ابھی سے میرے ایک بچے کو ایک طرف دھکیل دیا ہے اور خود اُس کی جگہ لے لی ہے۔ اور وہ موا لنگڑا قصائی اُسے مارنے آیا تھا۔ خود تو وہ اُسے مارنے کے بعد وین گنگا کی طرف دُم دبا کر بھاگ جاتا اور گانوں والے ہمارے تمام بھٹوں کو انتقام میں کھود ڈالتے۔ اس پر تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ کیا میں اُس کو پالوں گی؟ ہاں میں یقیناً اُس کی پرورش کروں گی؟ لیٹ جا رہ میرے ننھے سے مینڈک لیٹا رہ میں تیرا نام راجہ مینڈک رکھوں گی۔ اور ایک وہ دن آئے گا جبکہ تو شیر خاں کی وہی گت بنائے گا جو اُس نے تیری بنائی ہے۔"

اس پر بھیڑئیے نے کہا "مگر ہمارے غول والے کیا کہیں گے؟"

جنگل کا یہ صریح قانون ہے کہ جو بھیڑیا شادی کرے وہ اُس غول سے جس سے اُس کا تعلق ہے علیحدہ ہو سکتا ہے مگر جب اُس کے بچے چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں تو اُسے اُنہیں اپنے غول کی مجلس شورے میں جو مہینے میں ایک مرتبہ چاند کی چودہویں رات کو منعقد ہوتی ہے اس غرض سے لانا پڑتا ہے کہ دوسرے بھیڑئیے اُن کی شناخت کر سکیں۔ اس معائنہ کے بعد بچوں کو اجازت ہے کہ جہاں چاہیں کھلے پھریں اور جب تک کہ وہ اپنا ہرن کا پہلا شکار نہیں کر لیتے اُس وقت تک اگر غول کا کوئی بڑا بھیڑیا اُن میں سے کسی کو مار ڈالے تو اُس کا کوئی عذر سنا نہیں جاتا اور سراغ ملنے پر قاتل کی سزا موت ہوتی ہے۔ اور اگر تم ذرا غور کروگے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ قانون بالکل ٹھیک ہے۔

غرضکہ بھیڑئیے نے کچھ مدت تک انتظار کیا اور جب اُسکے بچے ذرا دوڑنے لگے قابل ہوئے ہوئے تو ایک رات جبکہ بھیڑیوں کے غول کی مجلس شورے کا اجلاس تھا۔ وہ راجہ مینڈک اور اپنی جورو کو لیکر مجلس شوریٰ کے ٹیکرے پر پہنچا۔ اس ٹیکرے پر بڑے بڑے پتھر جا بجا

بکھرے پڑے تھے جن میں سو بھیڑئیے چھپ سکتے تھے۔ ہم اپنے بھیڑئیے کو امتیاز کے لئے راجہ مینڈک کا باوا اور اُس کی مادہ کو راجہ مینڈک کی ماں کہیں گے۔ بھیڑیوں کے غول کا سردار اکیلا نامی جو اپنی شہ زوری اور دانائی کی بدولت اس رُتبہ کو پہنچا تھا۔ ایک اونچے چٹان پر لیٹا ہوا تھا اور اُس کے نیچے چالیس[۴] پچاس[۵] بھیڑئیے مختلف قد و قامت کے بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے بعض بچوں کے رنگ والے گرگ باراں دیدہ تھے جو ہرن کا شکار تن تنہا کر سکتے تھے۔ اور بعض جوان سہ سالہ کالے رنگ کے بھیڑئیے تھے جن میں سے ہر ایک کو کم از کم یہ زعم ضرور تھا کہ کسی دوسرے کی مدد کے بغیر ہم اکیلے ایک ہرن کو زیر کر سکتے ہیں۔ اکیلے کو اُس کی سرداری کے منصب پر سرفراز ہوئے اب ایک سال کا زمانہ ہونے کو آیا تھا۔ جوانی کے عالم میں وہ ایک دفعہ تو ایک جال میں پھنس چکا تھا اور ایک دفعہ اُس پر اتنے لٹھ برسے تھے کہ اُسے مُردہ جان کر لوگ چھوڑ کر چلے گئے تھے اور اس لئے وہ انسان کے عادات و اطوار سے خوب واقف تھا۔ ٹیکرے پر بات چیت بہت کم ہوئی۔ بھیڑیوں کے جو بچے اس موقعہ پر لائے گئے تھے وہ اُس حلقہ کے وسط میں جس کے گرداگرد اُن کے ماں باپ بیٹھے تھے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ تھوڑی تھوڑی سی دیر کے بعد ایک بڈھا بوڑھا بھیڑیا اُٹھتا تھا اور ایک بچہ کے پاس جا کر اُس کا غور سے معائنہ کرنے کے بعد دبے پاؤں اپنی جگہ کو لوٹ آتا تھا۔ بعض دفعہ کوئی ماں اپنے بچہ کو اس خیال سے کہ وہ نظرانداز نہ ہو جائے دھکیل کر ایسی جگہہ بٹھا دیتی تھی جہاں چاندنی کا پورا عکس اُس پر پڑ سکے۔ اکیلا اپنی چٹان پر سے کچھ کچھ دیر کے بعد پکارتا تھا "تم کو قانون معلوم ہی ہے اور تم اُس کے اصول سے واقف ہو۔ اے بھیڑیو خوب دیکھ بھال لو" اِس صدا کو سُنکر مائیں بھی جن کو اپنے بچوں کا شناخت کرانا دل و جان سے مقصود تھا پکار اُٹھتی تھیں کہ "اے بھیڑیو خوب دیکھ بھال لو"

آخر کار وہ وقت آ پہنچا جبکہ راجہ مینڈک کے باوا نے اُس کو حلقہ کے وسط میں دھکیل دیا جہاں وہ بیٹھکر ہنسنے لگا اور کچھ کنکروں سے جو چاندنی میں چمک رہے تھے کھیلنے لگا۔

اکیلا جو اپنے سر کو اپنے پنجوں پر رکھے ہوئے لیٹا تھا اسی وضع میں برابر اپنی اُسی ایک راگ کو گائے گیا کہ "اے بھیڑیو خوب دیکھ بھال لو" اتنے میں ٹیکرے کے پیچھے سے شیر خاں کے غرانے کی آواز آئی جو یہ کہتا ہوا سُنائی دیا "یہ بچہ میرا مال ہے۔ لاؤ اسے میرے حوالے کرو۔ بھیڑیوں کی آزاد قوم کو انسان کے بچے سے کیا سروکار؟" اکیلے نے یہ بات سن کر کان تک نہیں ہلایا۔ بلکہ صرف اسی قدر کہا۔

"اے بھیڑیو خوب دیکھ بھال لو۔ بھیڑیوں کی آزاد قوم کو کسی دوسرے قوم والے کا حکم ماننے سے کیا سروکار۔ اے بھیڑیو خوب دیکھ بھال لو"

اس پر بہت سے بھیڑیوں کے غرانے کی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ اور ایک جوان بھیڑئے نے جس کی عمر چار سال ہو گی شیر خاں کا سوال اکیلے سے دُہرایا کہ "بھیڑیوں کی آزاد قوم کو انسان کے بچے سے کیا سروکار۔؟" لیکن جنگل کا قانون یہ ہے کہ جب اس امر کے متعلق کوئی جھگڑا ہو کہ آیا کہ آیا فلاں بچہ کو یہ استحقاق ہے یا نہیں کہ اُسے غول منظور کرے تو ضرور ہے کہ اُس کی حامی غول کے کم از کم دو ایسے رکن ٹھیریں جو اُس کے ماں باپ نہ ہوں۔

چنانچہ اکیلے نے کہا "اس بچہ کا ضامن کون ہوتا ہے۔ آزاد قوم والوں میں سے کون ہے جو اُس کا جانب دار ہے؟" اس سوال کا جواب کسی نے کچھ نہیں دیا۔ اور راجہ مینڈک کی ماں مایوس ہو کر لڑنے مرنے کے لئے مستعد ہو گئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر بچہ کی طرف سے کوئی نہ بولا تو سوائے اس کے کہ میں سینہ سپر ہوں اور کوئی چارہ نہ ہو گا۔

لیکن کچھ دیر کے بعد ریچھ (جسے غول کی مجلس شوریٰ میں شریک ہونے کی اجازت ہے اور جس کا شمار اس لحاظ سے مستثنیات میں ہے کیونکہ وہ بھیڑیوں کے بچوں کو جنگل کا قانون سکھاتا ہے اور میوہ جڑی بوٹی اور شہد پر اکتفا کرنے کے باعث ہر جگہ جا آسکتا ہے) اپنے پچھلے پنجوں کے بل اُٹھا اور اپنے بھدے لہجہ میں پکارا۔

"کیا یہ آدمی کا بچہ ہے؟ اگر آدمی کا بچہ ہے تو میں اُس کی حامی بھرتا ہوں۔ آدمی کا بچہ ایک

بے ضرر چیز ہے۔ مجھے زیادہ باتیں تو بنانی آتی نہیں لیکن جو کچھ میں کہتا ہوں صحیح کہتا ہوں وہ کبھی تمہارے ساتھ بے وفائی نہیں کرے گا۔ اُسے اپنے غول کے ساتھ دوڑنے کی اجازت دو اور دوسرے بچوں کے ساتھ اُسے بھی شریک کر لو میں خود اُس کا اُستاد ہونگا۔"

اس پر اکیلا بولا "ابھی ایک اور چاہیئے۔ ریچھ نے تو اس بچہ کی حامی بھری اور وہ ہمارے چھوٹے بچوں کا اُستاد ہے لیکن علاوہ ریچھ کے اور بھی کوئی ایسا ہے جو اس بچہ کی ضمانت دے؟"

ایک سیاہ رنگ کا جانور حلقہ میں آکودا۔ یہ جانور چیتا تھا جس کا رنگ سر سے لیکر پاؤں تک بالکل سیاہ تھا لیکن ریشم کی سی چمک اُس میں موجود تھی چیتے کو سب جانتے تھے اور کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ اُس سے برسرِ پرخاش ہو کیونکہ مکاری میں وہ طباقی کے برابر شجاعت میں ارنے بھینسے کا ہمسر اور تہور میں زخمی ہاتھی کی جوڑ تھا لیکن آواز اُس کی درخت پر سے ٹپکتے ہوئے شہد کی طرح شیریں اور جلد اُس کی روئی کی طرح ملایم تھی چنانچہ خرخراتا ہوا وہ اس طرح بولا۔

"اے اکیلے اور اے دوسرے آزاد قوم والو اگرچہ مجھے تمہاری مجلس میں بات کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں لیکن جنگل کے قانون کا منشا یہ ہے کہ اگر کسی نئے بچہ کی شرکت کے متعلق کوئی شبہ ہو تو اُس بچہ کی جان خوں بہا دے کر خریدی جا سکتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کے قانون میں اس امر کی تصریح موجود نہیں کہ اُس خوں بہا کا پیش کرنے والا کون ہونا چاہیئے۔ میں نے درست بات کہی ہے نہ ؟

اس پر جوان بھیڑیوں نے جو ہمیشہ بھوکے ہی رہتے ہیں کہا "بالکل ٹھیک ہے چیتے کی بات دل کے کانوں سے سنو۔ اس بچہ کی جان قیمت دیکر خریدی جا سکتی ہے۔ قانون کا منشا یہی ہے۔"

چیتا بولا "مجھے خوب معلوم ہے کہ مجھے بات کرنے کا کوئی حق نہیں اور اس لئے میں تم سے اجازت طلب کرتا ہوں۔"

میں بھیڑیوں نے یک زبان ہو کر کہا "کہو کیا کہتے ہو"

چیتے نے یہ جواب دیا "نہایت شرم کی بات ہے کہ ایک بیکس ننگے بچے کو مار ڈالا جائے۔ اِس کے علاوہ جب وہ بڑا ہو جائے گا تو تمہارے بہت کام آئیگا۔ ریچھ نے اُس کی حامی بھری ہی ہے۔ اب میں ریچھ کی تائید کرتا ہوں۔ اور اگر آپ لوگ بچہ کو حسب منشاء قانون اپنی جماعت میں شریک کریں۔ تو میں اُس کی جان کی قیمت کے طور پر ایک موٹا تازہ بیل جو یہاں سے کوئی نصف میل کے فاصلہ پر ابھی ابھی مارا گیا ہے پیش کرتا ہوں۔ کیا اب بھی کوئی مشکل باقی ہے؟"

چیتے کی یہ بات سُن کر بیسیوں آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں اور یہ کہتی ہوئیں سُنائی دیں۔ "یہ بچہ کڑکڑاتے جاڑوں کے مینہ کی جھڑیوں میں ٹھٹھر کر مر جائے گا یا گرمی میں دُھوپ اور لُو سے جل جائے گا۔ ایک ننگا مینڈک ہم کو کیا ضرر پہنچا سکتا ہے۔ اُس کے غول کے ساتھ شریک ہو جانے میں کوئی ہرج نہیں۔ اے چیتے وہ بیل کہاں ہے؟" اس پر اکیلا بآوازِ بلند پکارا۔ "اے بھیڑیو خوب دیکھ بھال لو۔ خوب دیکھ بھال لو"

راجہ مینڈک ابھی تک کنکروں کے ساتھ کھیلنے میں ایسا محو تھا کہ جب بھیڑئے ایک ایک کر کے اُس کو دیکھنے آئے تو اُس نے اُن کی طرف توجہ نہیں کی آخر کار وہ سب کے سب مرے ہوئے بیل کی طرف چلے گئے۔ اور صرف اکیلا، چیتا، ریچھ اور راجہ مینڈک کے اپنے بھیڑئے وہاں رہ گئے۔ شیر خاں ابھی تک دہاڑ رہا تھا کیونکہ اُسے اس بات کا سخت غصہ تھا کہ راجہ مینڈک کیوں اُس کے حوالے نہیں کر دیا گیا۔

"چیتا اُس کی آواز سُن کر بولا "دہاڑے جا اور چنگھاڑے جا ایک دن وہ آنے والا ہے کہ یہی ننگا بیکس بچہ تجھے ایسا ناچ نچائیگا کہ تو بھی یاد ہی کرے گا۔ میں کیا انسان سے واقف نہیں ہوں؟"

اکیلے نے کہا "خوب ہوا۔ انسان اور اُس کے بچے بڑے دانا ہوتے ہیں ممکن ہے

کہ آڑے وقت کام آئے۔

چیتے نے جواب دیا "اس میں ذرا شک نہیں کہ مصیبت کے وقت یہ تمہارا ساتھ دیگا کیونکہ غول کا سردار کوئی ہمیشہ نہیں رہ سکتا"

اکیلے نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ اس وقت اُس گھڑی کا خیال کر رہا تھا جو غول کے ہر سردار کے لئے آتی ہے جبکہ اُس کی طاقت زایل ہو جاتی ہے اور وہ دن بدن ضعیف ہوتا جاتا ہے حتّٰی کہ دوسرے بھیڑئیے اُسے مار ڈالتے ہیں اور ایک نیا سردار پیدا ہو جاتا ہے اور پھر اسی طرح سے وقت مقررہ پر اُس کے مارے جانے کی بھی باری آتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے راجہ مینڈک کے باوا سے کہا "اس کو لے جاؤ اور اس کی تربیت اسی طرح پر کرو جیسے کہ ایک بھیڑئیے کی ہونی چاہیئے"

غرضکہ اس طرح راجہ مینڈک ریچھ کی سفارش پر اور ایک بیل کی قیمت کے عوض سیانی کے بھیڑیوں کے غول میں داخل ہو گیا۔

اس واقعے کے بعد دس گیارہ سال کی مدت گذر گئی اور اس عرصہ میں راجہ مینڈک حیرت انگیز طور پر بھیڑیوں میں پرورش پاتا رہا۔ اُس کی زندگی کے اس زمانہ کے واقعات کو اگر قلمبند کیا جائے تو دس بارہ کتابیں لکھی جائیں۔ مختصر یہ کہ جس بھیڑئیے نے اُسے اپنے غار میں پناہ دی تھی اُسی کے بچوں کے ساتھ وہ پل کر بڑا ہوا لیکن وہ ابھی بچہ ہی تھا اور اس کے بہن بھائی نشو و نما پا کر اُس سے پہلے جوان ہو چکے تھے۔ راجہ مینڈک کے باوا نے اپنے آدمی زاد بچہ کو جنگل کی زندگی کا ایک ایک گُر سکھایا اور جنگل کی تمام باتوں کا اُس کو سبق پڑھایا حتّٰی کہ گھاس کی ایک پتی کے کھڑکے رات کی معتدل ہوا کے ایک جھونکے کی جنبش۔ الو کے بولنے کی آواز۔ درخت پر ایک دم بھر کے لئے قرار لینے والے چمگادڑ کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور جوہڑ میں ہر ایک ننھی مچھلی کے کودنے سے پانی کے چھینٹے اڑنے کے شور کے اُس کے نزدیک وہی معنی تھے جو ایک کارگذار عہدہ دار کے نزدیک اپنے دفتر کے کام کے ہوتے ہیں سبق

سیکھنے کے اوقات کے علاوہ وہ دھوپ میں بیٹھتا اور سوتا اور کھاتا اور پھر سو جاتا۔ جب اُس کے بدن پر میل جمع ہو جاتا یا اُسے گرمی ستاتی تو جنگل کے جوہڑوں میں وہ تیر لیتا۔ ریچھ نے اُسے بتا رکھا تھا کہ شہد اور پھل ایسی ہی مزیدار چیزیں ہیں جیسے کہ کچا گوشت اور اس لئے جب اُسے شہد کھانے کی خواہش ہوتی تو وہ درخت پر چڑھ کر مکھیوں کے چھتے میں سے جتنا شہد چاہتا لے لیتا اور چیتا اُسے درخت پر چڑھنے کا ڈھب بتاتا چیتا پہلے خود ایک شاخ پر جا کر بیٹھتا اور پھر اُسے پکارتا کہ "بھیا اوپر آ جاؤ" اوّل اوّل تو راجہ مینڈک کو درخت پر چڑھنے میں بہت دقت پیش آئی بمشکل تمام رینگ رینگ کر وہ تنے سے شاخ تک پہنچتا لیکن رفتہ رفتہ اس میں اُسے ایسی مہارت ہو گئی کہ وہ بڑی جرأت سے بندر کی طرح ڈال ڈال اور پات پات پھرنے لگا۔ بھیڑیوں کے غول کے اجلاس والی رات کو وہ مجلس شوریٰ کے ٹیکرے پر بھی جاتا اور وہاں اُسے یہ بات معلوم ہو گئی کہ اگر وہ کسی بھیڑئے کو گھور کر دیکھتا تو وہ بھیڑیا طوعاً و کرہاً اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا چنانچہ کھیل کے طور پر وہ بھیڑیوں کو تاکا کرتا۔ بعض دفعہ وہ اپنے دوستوں کی پوستینوں میں سے کانٹے چن کر نکالتا کیونکہ جب بھیڑیوں کی کھال میں کانٹے چبھ جاتے ہیں یا اُس میں خس و خاشاک اُلجھ جاتا ہے تو اُنہیں بڑی تکلیف ہوتی ہے کبھی وہ رات کے وقت پہاڑی سے اُتر کر کھیتوں میں جاتا اور متحیر اور متعجب ہو کر گاؤں والوں کو اُن کے جھونپڑوں میں جھانکتا لیکن اُسے آدمیوں کی طرف سے بے اعتباری تھی کیونکہ چیتے نے ایک دفعہ اُس کو ایک صندوق جس میں ایک کھٹکے دار دریچہ لگا تھا۔ بتا کر کہا کہ یہ پھندا ہے۔ یہ صندوق جنگل میں اس حکمت سے چھپا ہوا رکھا تھا کہ قریب تھا کہ راجہ مینڈک اُس کے اندر چلا جائے چنانچہ اُسی دن سے وہ آدمیوں کو خوف کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ چیتے کے ساتھ وہ جنگل میں دور نکل جاتا اور دن کے وقت پڑا سویا کرتا اور جب رات آتی تو چیتے کو شکار کرتے دیکھتا۔ چیتا بھوک کی حالت میں دائیں بائیں ہر ایک چیز پر ہاتھ صاف کرتا۔ اور راجہ مینڈک بھی اُسی کی تقلید کرتا لیکن ایک چیز کو وہ کبھی نہ چھوتا۔ کیونکہ جب وہ ہر ایک بات کو سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا تو چیتے نے اُسے سمجھایا تھا کہ تو کبھی مویشیوں کو نہ ماریو۔ کیونکہ تیری

جان ایک بیل کی جان کے بدلے خریدی گئی تھی" چیتے نے اُس سے یہ بات کہی تھی "تمام جنگل تیرا ہے جس جانور کے مارنے کی طاقت تو اپنے آپ میں پائے اُسے تو مار سکتا ہے لیکن اُس بیل کی خاطر سے جو تیرا خون بہا تھا تجھے جوان یا بڈھے مویشیوں کو کبھی مارنا یا کھانا نہیں چاہئے۔ جنگل کا قانون یہی ہے۔" راجہ مینڈک نے اس نصیحت پر ہمیشہ عمل کیا۔

راجہ مینڈک نے اب حیرت انگیز طور پر نشو و نما پانا شروع کیا۔ بڑھتی عمر کے ساتھ اُس کے جسم میں منوں طاقت آتی چلی اور صاف ظاہر ہے کہ جس لڑکے کو اپنا سبق یاد نہ کرنا ہو اور جسے کھانے کی چیزوں کے سوائے اور کسی چیز کی فکر نہ ہو وہ کیا کچھ نہ پنپے گا۔

ایک یا دو دفعہ بھیڑئے کی مادہ نے جو اُس کی ماں تھی اُس سے کہا کہ "دیکھ شیر خاں پر کبھی اعتبار مت کیجو اور ایک نہ ایک دن اُسے ضرور مار ڈالیو۔" اِس نصیحت کو ایک بھیڑئے کا بچہ ہمیشہ یاد رکھتا لیکن راجہ مینڈک جو آخر آدمی زاد ہی تھا (گو کہ اگر اُس کو آدمیوں کی بولی آتی تو وہ اپنے آپ کو بھیڑیا ہی کہتا) اس نصیحت کو بھول گیا۔

شیر خاں سے جنگل میں اُس کی ہمیشہ مٹ بھیڑ ہوتی رہتی تھی کیونکہ جب اکیلا بڈھا اور کم زور ہوتا چلا تو لنگڑے شیر نے غول کے نو عمر بھیڑیوں کے ساتھ خوب دوستی گانٹھ لی اور وہ ایک آدھ بوٹی یا ہڈی کی خاطر اُس کے پیچھے پیچھے جایا کرتے۔ حالانکہ اکیلے کو اگر اپنے پورے اقتدارات حاصل ہوتے تو وہ ہرگز اس بات کا روادار نہ ہوتا۔ اِس حالت میں شیر خاں اُن کی تعریف کیا کرتا اور تعجب کرتا کہ ایسے تنومند اور نوخیز شکاری ایک انسان کے بچے اور ایک ایسے بھیڑئے کی سرداری پر قانع ہیں جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے وہ اُن سے کہا کرتا کہ میں نے سُنا ہے کہ مجلس شوریٰ میں تم اہل انسان کے بچے سے آنکھ نہیں ملا سکتے۔ اِس پر نوجوان بھیڑئے غرّاتے اور چلّاتے۔

چیتے کو بھی جو ہر ایک بات کی خبر رکھتا تھا اس ماجرے کی اطلاع ہو گئی اور اُس نے ایک دو دفعہ راجہ مینڈک سے کہا بھی کہ شیر خاں تم کو ایک نہ ایک دن مار ڈالے گا لیکن راجہ مینڈک نے ہنس کر

اور یہ جواب دیکر اُس کو ٹال دیا کہ غول میرے ساتھ۔ تم میرے ساتھ۔ ریچھ میرے ساتھ جو باوجود بھدا اور سُست ہونے کے میری خاطر میرے مخالفوں سے دو دو ہاتھ کرسکتا ہے پھر مجھے کس بات کی پروا۔؟

ایک دن جبکہ گرمی کی بڑی شدت تھی چیتے کو ایک نیا خیال پیدا ہوا جس کی محرک غالباً ایک خبر تھی جو اُس کے سُننے میں آئی تھی۔ شاید ریچھ نے اُس سے یہ بات بیان کی ہوگی۔ بہرحال ایک دن جبکہ جنگل کے بیچوں بیچ راجہ مینڈک چیتے کے خوبصورت اور سیاہ جسم پر سر رکھے ہوئے لیٹا تھا چیتے نے اُس سے کہا "بھیا میں نے تم سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ شیر خاں تمہارا جانی دشمن ہے"

راجہ مینڈک نے جسے قدرتی طور پر گننا نہ آتا تھا جواب دیا "جتنے سامنے کے تاڑ پر ناریل ہیں اگر مجھسے یہ بات بار بار تم کیوں کہتے ہو۔ بھائی مجھ کو دق نہ کرو اس وقت مجھے نیند آ رہی ہے شیر خان کی مجھ ایک مچھر جتنی بھی پروا نہیں۔ مور کی طرح اُس کی دُم بھی لمبی ہے اور آواز بھی بلند"۔

چیتا "یہ وقت سونے کا نہیں۔ شیر خاں کو تم سے جو عداوت ہے اُس کا حال ریچھ کو معلوم ہے۔ مجھ کو معلوم ہے۔ غول بھر کو معلوم ہے۔ حتیٰ کہ بھولے بھالے بے تمیز ہرنوں تک کو معلوم ہے طباقی نے بھی تم سے اس کا ذکر کیا ہوگا"

راجہ مینڈک "ہاں کچھ دیر ہوئی کہ طباقی میرے پاس آیا تھا۔ مگر میرے ساتھ بڑی گستاخی سے پیش آیا۔ مجھسے کہنے لگا کہ تو ننگا آدمی کا بچہ ہے اس قابل بھی نہیں کہ شکر قند کھود کر کھائے۔ لیکن میں نے بھی اُسکو دُم سے پکڑ کر دو دفعہ سر کے گرد گھمایا اور ایک ناریل کے درخت کے ساتھ دے پٹکا کہ ذرا تمیز سے بات کرنی سیکھے"۔

چیتا "تم نے بڑی حماقت کی۔ طباقی اگرچہ فتنہ انگیز ہے۔ لیکن اُس نے تم سے ایسی بات کہی ہوتی جس سے تمہیں بڑا فائدہ پہنچتا۔ بھیا اپنی ان آنکھوں کو ذرا کھولو اور عقل کے ناخن لو۔ شیر خاں کو تمہیں کھلے جنگل میں مارنے کی جرأت نہیں ہوسکتی لیکن یاد رکھو کہ اکیلا بہت ضعیف ہوگیا ہے اور

جلد دن آنے والا ہے جبکہ وہ ہرن کو تنہا زیر نہیں کر سکے گا۔ اور اُس وقت اُس کی سرداری چھن جائے گی۔ جن بھیڑیوں نے اُس وقت جبکہ تم اول اول مجلس شوریٰ میں لائے گئے تھے تم کو شناخت کیا تھا اُن میں سے بھی بہت سے ضعیف ہو گئے ہیں۔ اور نوخیز بھیڑیوں کو شیر خاں کی تعلیم کی بدولت یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ ایک انسان کے بچہ کا غول میں کچھ دخل نہیں تھوڑے دنوں میں تم پورے مرد ہو جاؤ گے۔"

راجہ مینڈک "تو مرد ہونے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ میں اپنے بھائی بندوں کے ساتھ زندگی بسر نہ کروں۔ میں جنگل میں پیدا ہوا۔ یہیں میں نے پرورش پائی۔ جنگل کے قانون کی میں نے تعمیل کی اور بہت سے بھیڑئے ایسے ہیں جن کے پنجوں میں سے میں نے کانٹے نکالے ہیں۔ یقیناً وہ میرے بہن بھائی ہیں۔"

چیتا زمین پر تن کر لیٹ گیا اور آنکھیں آدھی بند کر کے اور آدھی کھلی چھوڑ کے بولا "بھیا میرے جبڑے کے نیچے کے حصہ کو ذرا ٹٹولو تو!"

راجہ مینڈک نے چیتے کی نرم نرم ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ لیجا کر پھیرا تو سیاہ چمکدار بالوں کے تلے اُسے ایک چھوٹا سا داغ محسوس ہوا جہاں کے بال بالکل اُڑ گئے تھے۔

چیتے نے اپنے ساتھی کو مخاطب کر کے کہا "جنگل میں کسی کو معلوم نہیں کہ میرے گلے میں یہ داغ جو کہ طوق کا داغ ہے موجود ہے۔ بھیا میں آدمیوں ہی میں پیدا ہوا اور اُنہیں میں پلا میری ماں نے بھی اپنی عمر آدمیوں ہی میں گذاری اور اودے پور کے راجہ کے محل کے پنجرے میں اُس کا انتقال ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے بھیڑیوں کی مجلس شوریٰ میں جبکہ تم ایک ننھے سے بیکس بچے تھے تمہاری جان خوں بہا دے کر خریدی ہاں میں بھی آدمیوں ہی میں پیدا ہوا۔ میں نے جنگل کی صورت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ آہنیں سلاخوں کے پیچھے سے ایک لوہے کے طباق میں مجھے کھانا ڈالدیا جاتا تھا۔ جب میں بڑا ہوا تو ایک رات یکایک مجھے خیال پیدا ہوا کہ میں تو چیتا ہو گیا ہوں اور انسان کا کھلونا نہیں ہوں۔ اِس خیال کے آتے

ہی میں نے اپنے پنجے کی ایک ضرب سے تالے کو توڑ ڈالا اور بھاگ آیا۔ اور چونکہ میں آدمیوں کی عادات واطوار سے واقف ہوگیا تھا اس لئے میں جنگل میں شیر خاں سے بھی زیادہ مہیب ہوگیا۔ بولو ہوں یا نہیں ؟"

راجہ مینڈک نے جواب میں کہا "واقعی تمام جنگل والے سوائے میرے تم سے ڈرتے ہیں"

کالے چیتے نے نہایت شفقت اور پیار سے جواب دیا "بھلا تم مجھ سے کیوں ڈرنے لگے ۔ تم تو آدمی زاد ہو اور جس طرح میں جنگل میں چلا آیا ہوں اسی طرح تم بھی آخر کار آدمیوں میں جو تمہارے بھائی ہیں واپس چلے جاؤ گے ۔ بشرطیکہ اس اثنا میں تم مجلس شوریٰ میں مار نہ ڈالے گئے"

اس پر راجہ مینڈک نے پوچھا "کسی کو ایسی کیا غرض پڑی ہے کہ میری جان کے درپے ہو"

چیتے نے کہا "ذرا میری طرف نگاہ بھر کے تو دیکھو" راجہ مینڈک نے ایسا ہی کیا اور اس سے آنکھیں ملائیں۔ آدھ منٹ نہ گذرنے پایا تھا کہ چیتے نے اپنا سر پھیر لیا اور اپنے رفیق سے کہا۔

"یہی وجہ ہے کہ دوسرے تمہاری جان کے درپے ہیں۔ دیکھو بھیا میں بھی تم سے آنکھ نہیں ملا سکتا۔ باوجودیکہ میں آدمیوں میں پیدا ہوا اور پلا اور تم سے مجھکو محبت بھی ہے دوسروں کو تم سے نفرت ہے اور اس کا باعث یہ ہے کہ وہ تم سے آنکھ نہیں ملا سکتے تم دانا ہو۔ تم نے ان کے پاؤں میں سے کانٹے نکالے ہیں۔ قصہ کوتاہ یہ کہ تم انسان ہو"

راجہ مینڈک نے منہ بسور کر اور تیوری چڑھا کر کہا "مجھے ان باتوں کی خبر نہ تھی" اس پر چیتا بولا "تم جانتے ہو کہ جنگل کا قانون کیا ہے ؟ یہ ہے کہ پہلے مارو اور پھر بات کرو۔ تمہاری بے احتیاطی سے ہی ان کو معلوم ہوگیا ہے کہ تم انسان ہو لیکن تمہیں چاہئے کہ تم ہوشیار رہو۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ جب اکیلا اگلی دفعہ اپنے شکار کو زیر نہ کر سکا اور واقعی ہر ایک شکار میں اس کو ہرن کے مارنے میں پہلے کی نسبت زیادہ دشواری پیش آتی ہے۔ تو

غول اُس کے اور تمہارے خلاف ہو جائیگا۔ اُس وقت وہ ٹیکرے پر جنگل کی ایک مجلس منعقد کریں گے اور تب تمہاری جان پر آ بنے گی۔ لیکن مجھے ایک ترکیب سوجھی ہے اور وہ یہ کہ تم جلد آدمیوں کے اُن جھونپڑوں میں جو وادی میں واقع ہیں جاؤ اور کسی قدر سُرخ پھول جو وہاں اُگتے ہیں لیتے آؤ تاکہ جب وہ وقت آئے تو تمہاری مدد کو ایک ایسا دوست موجود ہو جو میرے یا ریچھ کے یا غول کے اُن بھیڑیوں کی نسبت بھی زیادہ زبردست ہے جن کو تم سے ابھی تک محبت ہے۔ جاؤ جا کر سُرخ پھول لے آؤ۔"

سُرخ پھول سے چیتے کی مُراد آگ تھی جنگل کا کوئی جانور آگ کا صحیح نام نہیں لیتا۔ ہر ایک درندہ اُس کا خیال دل میں لاتے ہی مارے خوف کے کانپ اُٹھتا ہے اور سینکڑوں ڈھنگ سے اُس کو بیان کرتا ہے۔

راجہ مینڈک نے کہا "وہی سُرخ پھول نہ جو انسانوں کی جھونپڑیوں کے باہر جھٹ پٹے کے وقت اُگتا ہے۔ میں کسی قدر جا کر لے آؤں گا۔"

چیتا یہ جواب سُن کر فخر سے بولا "حقیقت میں یہ بات تو نے آدمی زاد کی سی کہی۔ لیکن یہ یاد رکھ کہ یہ پھول چھوٹے چھوٹے برتنوں میں جنہیں چُولہا یا انگیٹھی کہتے ہیں اُگتا ہے۔ تو جلدی سے جا اور ایک اُٹھا لا اور ضرورت کے وقت کے لئے اپنے پاس رکھ چھوڑ۔"

راجہ مینڈک نے اپنا ایک ہاتھ چیتے کی شاندار گردن میں حمائل کیا اور بولا "بہت اچھا میں جاتا ہوں لیکن یہ تو مجھکو بتاؤ کہ تمہیں پورا یقین ہے کہ یہ سب پاکھنڈ شیر خاں نے پھیلایا ہے۔"

چیتا "بھیا قسم ہے مجکو اُس ٹوٹے قفل کی جس نے مجکو آزاد کیا کہ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے۔"

راجہ مینڈک "تو مجکو بھی قسم ہے اُسی بیل کی جو میرا خون بہا تھا کہ میں شیر خاں کو اُس کی اس حرکت کا پورا پورا مزہ چکھاؤں گا۔"

یہ کہہ کر راجہ مینڈک چھلانگیں بھرتا ہوا تھوڑی دیر میں چیتے کی نظروں سے غائب ہو گیا

اور چیتا زمین پر لیٹ کر آپ ہی آپ بولا "پورا آدمی زاد ہے سر سے لیکر پاؤں تک اس میں انسانی شان ہے۔ بھلا رے شیر خاں کہاں جاتا ہے تو۔ دیکھ تو سہی تجھ پر کیا آفت آتی ہے وہ دن بھی تیرے لئے بڑا ہی بدقسمتی کا تھا جبکہ تو دس سال قبل مینڈک کے شکار کے لئے نکلا تھا"

راجہ مینڈک فراٹے بھرتا ہوا جنگل کو جلد جلد طے کر رہا تھا۔ اور مارے غصہ کے اُس کے تن بدن میں آگ لگ رہی تھی۔ سر شام وہ غار کے مُنہ پر پہنچا اور سانس لینے کے لئے رُکا۔ اُس کے بھائی شکار کے لئے باہر نکل گئے تھے لیکن اُس کی ماں غار میں موجود تھی۔ اور اُس کے زور زور سے سانس لینے کی آواز سن کر اُس نے سمجھا کہ میرے مینڈک کے دل کو کوئی صدمہ پہنچا ہے۔ چنانچہ اُس نے اندر سے پکارا "کہو بیٹا کیسے ہو؟"

راجہ مینڈک نے جواب میں کہا "یہ شیر خاں بڑا اترا رہا ہے اس نے مجھے دق کر دیا ہے میں آج کی رات کھیتوں میں جا کر شکار کرونگا" یہ کہہ کر اُس نے ایک جست لگائی اور جھاڑیوں میں سے دوڑتا ہوا وادی میں ندی کے کنارہ پہنچا۔ یہاں وہ کچھ دیر کے لئے رُکا۔ کیونکہ اُس نے غول کے شکار کرنے کا شور و غل سُنا اور اُس کے بعد ایک سانبھر کے ڈکرانے اور زور زور سے خراٹے لینے کی آواز آئی جس سے معلوم ہوا کہ سانبھر پلٹ کر اپنے دُشمنوں کے مُقابلہ کے لئے کھڑا ہو گیا ہے۔ اِس کے بعد جوان بھیڑیوں کی خباثت انگیز چیخیں بلند ہوئیں اور اُنہوں نے یہ پکارنا شروع کیا "کہاں ہے اکیلا۔ کدھر گیا اکیلا۔ اب ہے اکیلے کی طاقت آزمائی کا وقت۔ غول کے سردار کے لئے جگہ چھوڑو۔ اے اکیلے جا دبوچ اپنے شکار کو"

اِس وقت ضرور ہے کہ سردار بھیڑئے نے سانبھر پر حملہ کیا ہو اور اُس کا وار خطا گیا ہو کیونکہ راجہ مینڈک نے اکیلے کے دانتوں کے بجنے کی آواز اور پھر اُس کی ایک چیخ سُنی جس سے معلوم ہوا کہ سانبھر نے اپنا اگلا کُھر مار کر اُس کو گرا دیا ہے۔"

اس کے بعد راجہ مینڈک نے انتظار نہیں کیا بلکہ جھپٹتا ہوا بڑھا چلا گیا۔ اور بھیڑیوں کی چیخ پکار کی آواز کم ہوتی گئی۔ آخر کار وہ کھیتوں میں جہاں کسان لوگ رہتے تھے جا پہنچا اور چارہ کے

کے ایک ڈھیر میں جو ایک جھونپڑے کے ساتھ لگا ہوا تھا چھپ کر دل ہی دل میں کہنے لگا "چیتا سچ کہتا تھا۔ کل کے دن جو حال اکیلے کا ہوگا وہی میرا بھی ہوگا" اب وہ کھڑکی میں سے جھانک کر چولھے میں آگ کو جلتے دیکھتا رہا۔ اُس نے دیکھا کہ کسان کی بی بی کسی کالی کالی چیز کے ٹکڑے آگ میں ڈالتی ہے جس سے آگ دہک اُٹھتی ہے۔ جب صبح ہوئی اور سردی کی شدت سے دُھند اور کُہر چاروں طرف چھاگیا تو اُس نے دیکھا کہ کسان کے لڑکے نے درخت کی شاخوں سے بنی ہوئی ایک ٹوکری جس کے اندر مٹی کا ایک برتن رکھا ہے اُٹھائی ہے۔ اور اُس میں سرخ دہکتے ہوئے انگار بھر کر اسکو اپنے کمبل کے نیچے رکھ لیا ہے۔ اور گایوں کو دیکھنے بھالنے کے لئے باڑے کی طرف جا رہا ہے۔

یہ دیکھکر راجہ مینڈک نے کہا کہ اگر ایک چھوٹا سا بچہ اس کام کو کر سکتا ہے تو پھر مجھے اس کا کیوں ڈر ہو۔ چنانچہ وہ اپنی کمیں گاہ سے نکل کر لڑکے کی طرف بڑھا اور اُس کے ہاتھ سے آگ کی انگیٹھی چھین کر چلتا بنا۔ لڑکا بیچارہ ڈر کے مارے چیختا چلاتا رہ گیا۔

جس طرح کسان کی بی بی کو اُس نے کرتے دیکھا تھا اُسی طرح رستہ میں راجہ مینڈک آگ کو پھونکیں مارتا گیا اور کہنے لگا کہ جھونپڑوں کے رہنے والے شکل صورت میں مجھ سے ملتے جلتے ہیں۔ اس کے بعد وہ بولا کہ اگر میں نے اس سرخ چیز کو جو میرے پاس ہے کھانے کو کچھ نہ دیا تو یہ مرجائے گی۔ اور یہ کہہ کر درخت کی سوکھی ہوئی چھال اور کچھ ٹہنیاں اُس نے آگ میں ڈال دیں اور ڈالنے کے ساتھ ہی آگ سلگ اُٹھی۔ پہاڑی پر چڑھتے وقت اُسے چیتا ملا جس کے سیاہ لباس پر صبح کی شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

چیتا "اکیلے کا وار خطا گیا۔ وہ اُسے کل رات ہی مار ڈالتے لیکن اُنہیں تیری بھی ضرورت تھی تجھے وہ پہاڑی پر اِدھر اُدھر ڈھونڈتے رہے"

راجہ مینڈک نے آگ کی انگیٹھی اوپر اُٹھا کر چیتے کو دکھائی اور کہا "میں کل کھیتوں میں تھا۔ اب میں ہر طرح سے تیار ہوں۔ یہ دیکھ لو"

چیتا: "تم نے خوب کیا لیکن میں نے دیکھا کہ آدمی ایک خشک شاخ کو اس چیز میں ڈالتے ہیں اور تھوڑی دیر میں شاخ کے کنارہ پر سرخ پھول کی کلیاں کھل جاتی ہیں تم ڈرتے تو نہیں؟"

راجہ مینڈک "میں کیوں ڈرنے لگا۔ اگر یہ واقعہ خواب نہیں ہے تو مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب میں بھیڑیا نہ تھا تو میں سرخ پھول کے پاس پڑا رہتا تھا اور وہ گرم گرم اور خوش آیند ہوتی تھی۔

دن بھر راجہ مینڈک غار میں بیٹھا ہوا اپنی آگ کی انگیٹھی کی نگہبانی کرتا رہا اور کچھ کچھ دیر کے بعد اُس میں خشک ایندھن جھونکتا رہا۔ اور ایک موٹی سی سوکھی شاخ اُس نے اپنے پاس رکھ لی کہ آگ کے دہکانے کے لئے وقت پر کام آئے۔ شام کے وقت طباقی غار میں آیا اور گستاخانہ طور سے اُسے کہنے لگا کہ چلو تمہیں مجلس کے ٹیکرے پر بُلا رہے ہیں۔ راجہ مینڈک حقارت سے ہنس دیا اور طباقی حیران ہو کر وہاں سے بھاگا۔ کچھ دیر بعد راجہ مینڈک ہنستا ہوا مجلس میں پہنچا۔

جس چٹان پر اکیلا بیٹھا کرتا تھا وہ آج خالی تھا اور اکیلا اُس کے ساتھ ایک طرف لگ کر بیٹھا ہوا تھا گویا کہ یہ اس بات کی علامت تھی کہ غول کی سرداری خالی ہے۔ شیر خاں اُن بھیڑیوں کو جنہیں اُس نے اپنے ٹکڑوں پر پالا تھا۔ ساتھ لئے ٹہل رہا تھا۔ چیتا راجہ مینڈک کے قریب بیٹھا تھا اور آگ کی انگیٹھی راجہ مینڈک کے گھٹنوں کے درمیان رکھی تھی۔ جب سب جمع ہو چکے تو شیر خاں نے تقریر شروع کی جس زمانہ میں اکیلا زوروں پر تھا شیر خاں کو یہ مجال نہ تھی کہ ایسا کرے۔

چیتے نے چپکے سے راجہ مینڈک کے کان میں کہا: "اسے بولنے کا کوئی حق حاصل نہیں تم سب سے علانیہ یہ بات کہہ دو۔ یہ کتّے کا پلا ڈر جائے گا۔"

راجہ مینڈک فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور پکارا: "اے آزاد قوم والو کیا تمہارے غول کا سردار شیر خاں ہے

ایک غیر کو ہماری سرداری سے کیا سروکار؟"

اس پر شیر خاں نے جواب میں یہ کہنا شروع کیا "چونکہ غول کی سرداری کا منصب خالی ہے اور مجھ سے درخواست کی گئی ہے کہ میں تقریر کروں۔"

راجہ مینڈک نے قطع کلام کر کے کہا "کس کی اجازت سے یہ بولنے کھڑا ہوا۔ کیا ہم سب گیدڑ ہیں کہ اس مویشیوں کے قصائی کی گیدڑ کے مانند خوشامد کریں؟ غول کی سرداری کے مستحق وہی ہیں جن کا تعلق براہ راست غول سے ہے۔"

اس پر بہت سی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں اور نوخیز بھیڑیوں نے جو شیر کے طرفدار تھے چیخ کر کہا "ابے آدمی کے بچے خاموش! شیر خاں کو بات کرنے کی اجازت ہے اس نے ہمارے قانون کی تعمیل کی ہے۔" لیکن یہ شور ابھی فرو نہ ہوا تھا کہ غول کے سن رسیدہ بھیڑیوں نے کڑک کر کہا "چپ رہو۔ مُردہ بھیڑئے کو بولنے دو۔ دیکھیں اس کی کیا رائے ہے۔"

جب بھیڑیوں کے غول کے کسی سردار کا وار اپنے شکار پر خطا جاتا ہے تو جب تک کہ وہ زندہ رہتا ہے (اور یہ مدت زیادہ نہیں ہوتی) اسے مُردہ بھیڑیا کہتے ہیں۔

اکیلے نے اپنا سر آہستہ سے اُٹھایا اور بولا۔

"اے آزاد قوم والو سنو اور اے شیر خاں کے گیدڑو تم بھی یاد رکھو کہ بارہ سال تک میں تمہارا سردار رہا۔ اس تمام زمانہ میں نہ کوئی بھیڑیا پھندے میں پھنسا اور نہ کوئی لنگڑا ہوا۔ اب میں ضعف کے باعث اپنے شکار کو زیر نہیں کر سکتا۔ تم جانتے ہو کہ میرے برخلاف یہ ایک سازش کی گئی تھی اور تمہیں خوب معلوم ہے کہ تم دیدہ و دانستہ ایک زبردست اور نئے سانبھر کو میرے سامنے لائے تاکہ میری کمزوری ظاہر ہو۔ تم نے واقعی بڑی چالاکی کی اب تم کو حق حاصل ہے کہ مجلس شوریٰ کے اس ٹیکرے پر مجھکو مار ڈالو۔ میں تیار ہوں اور اسلئے تم سے پوچھتا ہوں کہ اکیلے بھیڑئے کا خاتمہ کرنے کے لئے کون آگے بڑھتا ہے کیونکہ جنگل کے قانون کی رو سے مجھکو یہ حق حاصل ہے کہ تم ایک ایک کر کے مجھ پر حملہ کرو۔

جب اکیلا یہ بات کر چکا تو دیر تک خاموشی کا عالم طاری رہا کیونکہ کسی ایک بھیڑیئے کی یہ ہمت نہ پڑتی تھی کہ اکیلے سے یکہ و تنہا نبرد آزما ہو۔ آخرکار شیر خاں دھاڑ کر بولا "ہمیں اس بڈھے مسخرے سے جس کے منہ میں دانت نہیں کیا سروکار۔ اُس پر تو موت کا فتویٰ لگ چکا ہمیں تو یہ انسان کا بچہ چاہیئے جو بہت دن اڑا اڑا پھر رہا ہے۔ اے آزاد قوم والو وہ شروع ہی سے میرا شکار تھا۔ لاؤ اسے میرے حوالے کرو۔ اِس انسان اور بھیڑیئے کی حماقت کے نتیجے نے میرا دم ناک میں کر رکھا ہے۔ دس سال سے یہ جنگل کے لیئے بلائے بے درمان بن رہا ہے۔ اِس آدمی کے بچے کو میرے حوالہ کر دو ورنہ میں ہمیشہ یہیں شکار کیا کرونگا اور تم کو ایک ہڈی تک نہ دونگا مجھے اس سے بوجہ اس کے انسان کی نسل سے ہونے کے جانی دشمنی اور نفرت ہے"

اِس پر غول کے نصف سے زیادہ بھیڑیئے چلّا اُٹھے "یہ آدمی زاد ہے اس آدمی زاد کا ہم میں کیا کام؟ اُسے اپنے اصلی وطن کو چلا جانے دو"

شیر غرّا کر بولا "اسے اپنے اصلی وطن کو چلا جانے دوگے تو کیا وہ تمام گاؤں والوں کو ہماری بیخ کنی کے لیئے آمادہ نہ کرے گا۔ نہیں نہیں بہتر یہی ہے کہ تم اُسے میرے حوالے کرو۔ وہ آدمی زاد ہے اور ہم میں سے کوئی اُس سے آنکھ نہیں ملا سکتا"

اکیلے نے اپنا سر پھر اُٹھایا اور بولا "وہ ہمارا ہم نوالہ و ہم پیالہ بن رہا ہے۔ ہمارے ساتھ مل کر وہ سویا ہے۔ ہمارے لیئے اُس نے شکار کو جھاڑیوں میں سے ہانکا ہے اور جنگل کے قانون کے کسی قاعدے کو اُس نے نہیں توڑا"

اس وقت چیتے نے اپنے شیریں ترین لہجہ میں کہا "اس کے علاوہ جب تم نے اُس کو اپنے غول میں شریک کیا تو میں نے ایک بیل اُس کی قیمت کے طور پر تمہاری نذر کیا تھا۔ بیل کی قیمت شاید زیادہ نہ ہو لیکن چیتے کی آبرو ایک ایسی شے ہے جس کے لیئے وہ لڑنے مرنے سے بھی دریغ نہ کرے گا"

غول کے نوجوان بھیڑیوں نے غرا کر کہا "وہی بیل نہ جس کی ادائی کو دس سال کا زمانہ گذرتا ہے۔ ہمیں اُن دس سال کی بوسیدہ ہڈیوں کی کیا پرواہ ہے"

چیتے نے اپنے سفید دانت دکھا کر جواب دیا "اور تمہیں اپنے قول کا بھی پاس نہ ہوگا! آزاد قوم والے تمہارا لقب کس مسخرے نے رکھا تھا"

اس پر شیر چیخ کر بولا "جنگل والوں کے ساتھ کوئی آدمی زاد نہیں رہ سکتا۔ اس آدمی کے بچے کو میرے حوالے کرو"

اکیلا جو اس وقت تک خاموش تھا پھر بولا "ایک ہمارا خون تو اس کی رگوں میں نہیں دوڑتا لیکن باقی ہر ایک لحاظ سے وہ ہمارا بھائی ہے باوجود اس کے تم اس کی جان کے درپے ہو۔ میری جو پوچھو تو میں بہت دن زندہ رہ چکا ہوں اور اب مجھے زیادہ جینے کی ہوس نہیں۔ تم میں سے بعض ایسے ہیں جنہوں نے مویشی مار کر کھانا شروع کر دیا ہے اور بعض کی نسبت میں نے یہ سنا ہے کہ شیر خاں کے سکھے سکھائے وہ رات کے وقت جا کر گاؤں والوں کے دروازوں پر سے بچوں کو جھپٹا مار کر لے آتے ہیں۔ اس لئے میں جانتا ہوں کہ تم بزدل ہو اور بزدلوں سے ہی میرا خطاب ہے۔ میرا مرنا تو اب یقینی ہے اور میری زندگی کی قدر و قیمت کچھ نہیں ورنہ میں اس آدمی کے بچہ پر اسے نثار کرتا۔ لیکن غول کی عزت و آبرو کے خیال سے جس کو بے سرے ہو کر تم بھول گئے ہو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم آدمی کے بچہ کو اپنے اصلی وطن میں چلا جانے دو گے تو جب میرے مرنے کا وقت آئیگا اُس وقت میں تم سے لڑوں گا نہیں بلکہ خوشی سے اپنی جان دے دونگا۔ اس سے غول کے کم از کم تین بھیڑیوں کی جانیں بچ رہیں گی۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن ہاں اگر تم چاہو تو اُس شرم کو مٹا سکتا ہوں جس کا داغ ایک ایسے بے گناہ بھائی کی جان لے لینے کے باعث تم پر لگے گا جو جنگل کے قانون کی رو سے غول میں شریک ہو چکا ہے"

اکیلے کی اس تقریر کا غول پر کچھ اثر نہیں ہوا کیونکہ بھیڑیوں نے غرا کر یہ کہنا شروع کیا۔

"یہ آدمی زاد ہے۔ یہ آدمی زاد ہے لیجیو لیجیو جانے نہ پائے" اور بہت سے بھیڑیئے شیر خاں کے گرد جمع ہو گئے جو اپنی دُم کو قمچی کی طرح زمین پر مارنے لگا۔

اس وقت چیتے نے راجہ مینڈک سے کہا "اب آگے تو جانے اور تیرا کام ہم سے واسطے لڑنے کے اور اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

راجہ مینڈک آگ کی انگیٹھی کو ہاتھ میں لیکر سیدھا کھڑا ہو گیا اُس نے اپنے بازو پھیلائے اور ایک انگڑائی لی غم اور غصہ کا ایک طوفان اُس کے دل میں اُسوقت جوش زن تھا کیونکہ اس وقت تک بھیڑیوں نے اُس پر اپنی نفرت اور عداوت ظاہر نہیں کی تھی۔ سچ ہے

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود گرچہ با آدمی بزرگ شود

راجہ مینڈک نے دانت پیسکر اُن سے یوں خطاب کیا "سنو تمہاری اِس کتوں کی سی بھوں بھوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم نے آج رات اتنی مرتبہ مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ میں انسان ہوں (حالانکہ میں مرتے دم تک تمہارے ساتھ بھیڑیوں کی طرح زندگی بسر کرنے پر راضی تھا) کہ میرا دل گواہی دینے لگا ہے کہ تمہاری بات سچ ہے۔ اس لئے اب تکو اپنے بہن بھائی کہہ کر نہیں پکارتا بلکہ جیسا کہ انسان کے لئے زیبا ہے میں کہتا ہوں کہ تم کتے ہو۔ یہ تمہارا منصب نہیں ہے کہ یہ دعویٰ کرو کہ ہم فلاں بات کریں گے اور فلاں بات نہیں کریں گے۔ یہ کام میرا ہے اور اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے میں جو کہ انسان ہوں تھوڑے سے وہ سُرخ پھول لے آیا ہوں جس سے تم کتے اس قدر ڈرتے ہو۔"

یہ کہہ کر اُس نے انگیٹھی کو زمین پر دے پٹکا اور دہکتے ہوئے انگاروں سے کچھ سوکھی گھاس کو جو وہاں پڑی تھی آگ لگ اُٹھی۔ تھوڑی دیر میں شعلے بلند ہونے شروع ہوئے اور تمام جانور خائف و ہراساں ہو کر پیچھے سرک گئے۔

راجہ مینڈک نے کچھ خشک ایندھن جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا آگ میں جھونک دیا جس سے آگ اور بھی زیادہ بھڑک اُٹھی اور بھیڑیوں نے جب شعلوں کی لپٹ کو اُس کے سر کے

برابر بلند ہوتا دیکھا تو ڈر کر اور بھی پیچھے ہٹ گئے۔

چیتے نے چپکے سے کہا "اس وقت حکومت تیرے ہاتھ میں ہے۔ اکیلے کو تو موت سے بچا۔ اُس نے تیرے ساتھ ہمیشہ حق دوستی ادا کیا ہے"

اُس گرگ باراں دیدہ یعنی اکیلے نے جس نے عمر بھر کسی سے رحم کی التجا نہ کی تھی اُس وقت راجہ مینڈک پر جو آگ کے کودتے ہوئے شعلوں کی روشنی میں ننگا کھڑا تھا اور جس کے سیاہ لمبے بال اُس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے ایک عاجزی بھری ہوئی نگاہ ڈالی۔

راجہ مینڈک نے چاروں طرف نظر دوڑا کر کہا "اچھا میں نے دیکھ لیا کہ تم کتے ہو اور تمہاری حقیقت اُس سے زیادہ نہیں۔ میں اب تم کو چھوڑ کر اپنی قوم کے لوگوں میں جاتا ہوں بشرطیکہ وہ میری قوم کے لوگ ہوں جنگل کا دروازہ اب میرے لئے بند ہے اور مجھ پر لازم ہے کہ میں تمہاری بولی اور تمہاری رفاقت کا خیال دل سے بھلا دوں۔ لیکن میں تمہارے ساتھ زیادہ فیاضی کا برتاؤ کرونگا۔ چونکہ خون کے رشتہ کے علاوہ میں باقی ہر ایک لحاظ سے تمہارا بھائی تھا اس لئے میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب میں جا کر آدمیوں میں مل جاؤں گا۔ تو جس طرح تم نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے اس طرح میں تمہارے ساتھ بے وفائی کر کے تمہارا راز اُن پر افشا نہیں کرونگا"

یہ کہہ کر اُس نے آگ پر اپنا پاؤں مارا اور چنگاریاں اُڑنے لگیں۔ پھر وہ بولا۔ غول والوں میں سے کسی کے ساتھ میری لڑائی نہیں۔ البتہ قبل اس کے کہ میں یہاں سے جاؤں مجھے ایک فرض ادا کرنا ہے"

یہ کہہ کر وہ شیر خاں کی طرف جو الو کی طرح بیٹھا ہوا آنکھیں آدھی بند کئے شعلوں کی طرف دیکھ رہا تھا بڑھا۔ چیتا اِس خیال سے کہ مبادا معاملہ طول کھینچے اُس کے ساتھ ساتھ تھا۔ شیر کی ٹھوڑی پر کے بالوں کو ہاتھ میں پکڑ کر راجہ مینڈک نے غصہ میں اُس سے کہا "اٹھ اے کتے

اُٹھ جب ایک انسان تجھکو حکم دیتا ہے تو اُس کی تعمیل کر ورنہ تیری کھال کو آگ لگا دونگا"
شیر خاں نے اپنا کان تک نہیں ہلایا اور آنکھیں بالکل بند کرلیں کیونکہ جلتی ہوئی لکڑی اُس کے بالکل قریب تھی۔ پھر راجہ مینڈک نے کہا۔

"اِس گایوں بھینسوں کے کھانے والے نے کہا تھا کہ چونکہ یہ مجھے اُس زمانہ میں جبکہ میں بچہ تھا مار نہیں سکا اِس لئے اب اِس مجلس میں یہ مجھکو مار یگا۔ اِس کی صورت تو دیکھو ہم انسان جب کتوں کو پیٹتے ہیں تو اس طرح پیٹا کرتے ہیں۔ لنگڑے خبردار جو تو نے اپنی مونچھ کا ایک بال ہلایا ورنہ تیرے حلق میں یہی سرخ پھول ٹھونس دونگا"

یہ کہہ کر اُس نے جلتی ہوئی لکڑی شیر خاں کے سر پر زور سے ماری اور شیر مارے خوف کے چیخنے اور چلانے لگا۔ پھر وہ بولا۔

"نکل اب یہاں سے لے آگ کے جلے ہوئے جنگلی بلے لیکن یہ یاد رکھ کہ جب میں مجلس شوریٰ کے ٹیکری پر دوبارہ آؤں گا جیسا کہ ایک انسان کو آنا چاہئے تو میں تیری کھال اپنے سر پر اوڑھ کر آؤں گا۔ اب رہا اکیلا۔ اُس کو پوری آزادی حاصل ہے کہ جس طرح چاہے زندگی بسر کرے۔ خبردار جو تم لوگوں نے اُس کا بال بیکا کیا۔ تم اُس کو نہیں مار سکتے۔ کیونکہ میں تم کو یہ حکم دیتا ہوں۔ اور اب تمہاری بھی یہاں ضرورت نہیں۔ زبانیں نکالے ہوئے تم اِس طرح سے بیٹھے ہو کہ گویا تم بھی کچھ ہو۔ حالانکہ تمہاری حقیقت کتوں سے زیادہ نہیں جن کو میں دھتکار کر اِس طرح نکال دیتا ہوں۔ دور ہو جاؤ میری آنکھوں کے سامنے سے" جو جلتی ہوئی لکڑی راجہ مینڈک کے ہاتھ میں تھی وہ خوب دہک رہی تھی اور راجہ مینڈک نے دائیں بائیں جتنے بھیڑئے تھے سب کو اُس سے مارنا شروع کیا۔ بھیڑئے چیخنے چلانے بھاگ گئے اور آگ کی چنگاریوں سے اُن کے بال جل گئے۔ آخرکار صرف اکیلا۔ چیتا اور شاید دس بھیڑئے جنھوں نے راجہ مینڈک کی حمایت کی تھی باقی رہ گئے اِس وقت راجہ مینڈک کے دل میں ایک عجیب دردانگیز کیفیت پیدا ہوئی اور اُسے ایسا صدمہ پہنچا جو اُس سے پہلے کبھی نہ پہنچا تھا۔ آہ بھر اور ہچکیاں لیکر وہ رونے

لگا اور آنسوؤں سے اُس کے رخسارے تر ہو گئے۔

چیتے سے اُس نے پوچھا "یہ کیا ہے؟ یہ کیا ہے؟ میں تو جنگل کو چھوڑنا نہیں چاہتا اور مجھے نہیں معلوم کہ مجھکو یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا میرا دم نکل رہا ہے۔؟"

چیتے نے جواب دیا "بھیا دوست یہ صرف آنسو ہیں جو آدمی بہایا کرتے ہیں۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ تم مرد ہو گئے اور بچہ نہیں رہے۔ جنگل کا دروازہ واقعی میں اب تمہارے لئے ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ بھیا ان کو بہنے دو۔ یہ صرف آنسو ہیں"

غرضکہ راجہ مینڈک بیٹھ کر رونے لگا اور اتنا رویا کہ اُس کی ہچکیوں کا تار بندھ گیا۔ اس سے پہلے وہ کبھی نہیں رویا تھا۔

آخر کار وہ بولا "میں اب آدمیوں کے پاس جاؤں گا۔ لیکن پہلے میں اپنی ماں سے تو رخصت ہو لوں" یہ کہہ کر اُس غار میں جہاں وہ بھیڑیئے کے ساتھ رہتی تھی گیا اور اُس کی کھال پر مُنہ رکھ کر زار و قطار رونے لگا اور بھیڑیئے کے چاروں بچے اُس کی یہ حالت دیکھ کر چلّانے لگے۔

جب راجہ مینڈک کے آنسو ذرا تھمے تو اُس نے اپنی ماں باپ اور بھائی بہنوں سے مخاطب ہو کر کہا "تم لوگ مجھے بھول تو نہ جاؤ گے"؟

بچوں نے جواب دیا "ہم ہرگز نہ بھولیں گے۔ جب تم آدمی ہو جاؤ تو پہاڑی کے نیچے آنا ہم وہاں تم سے باتیں کر لیا کریں گے۔ اور رات کے وقت کھیتوں میں ہم تمہارے ساتھ کھیلنے کے لئے آیا کریں گے۔

بھیڑیئے نے کہا "بیٹا جلدی آنا کیونکہ میں اور تمہاری ماں اب بڈھے ہو چلے ہیں"

بھیڑیئے کی مادہ بولی "میرے پیارے ننھے سے بیٹے جلدی آنا۔ کیونکہ گو تو اصل میں آدمی زاد ہے لیکن مجھ کو تو اپنے بچوں سے بھی زیادہ پیارا ہے"

اس کا جواب راجہ مینڈک نے دیا "میں یقیناً آؤں گا اور جب میں آؤں گا تو شیر خاں کی کھال مجلس شوریٰ

کے ٹیکرے پر پہچاؤں گا۔ مجھے بھول نہ جانا اور سب جنگل والوں سے کہنا کہ مجھے یاد رکھیں۔

پو پھٹ رہی تھی کہ راجہ مینڈک پہاڑی سے اکیلا اُتر کر اُن اَن بوجھی چیزوں سے ملنے گیا جن کو انسان کہتے ہیں ✤

کوہستان سیبانی کے بھیڑیوں کے غول کا راگ

نور کا تڑکا تھا کہ پکارا سانبھر بن میں ڈکرا کر — ایک دفعہ پھر دوسری مرتبہ رہ رہ کر پھر تیسری بار
جنگل میں جوہڑ کے کنارے ہرنوں کا جو رمنا ہے — بھرتی چھلانگیں نکلی وہاں سے ہرنی ایک ہوا پہ سوار
چھپ کے کھڑا تھا واں میں اکیلا میں نے اسکو دیکھ لیا — ایک دفعہ پھر دوسری مرتبہ رہ رہ کر پھر تیسری بار

نور کا تڑکا تھا کہ پکارا سانبھر بن میں ڈکرا کر — ایک دفعہ پھر دوسری مرتبہ رہ رہ کر پھر تیسری بار
بھیڑیا اک دبے پاؤں پلٹ کر پہنچا اپنی غول میں اور — بولا اپنے ساتھیوں سے چلو تاک کے میں آیا ہوں شکار
کھوج لگا کر سانبھر کا ہم نعرے مارتے دوڑ پڑے — ایک دفعہ پھر دوسری مرتبہ رہ رہ کر پھر تیسری بار

نور کا تڑکا تھا کہ پکارا غول ہمارا غرا کر — ایک دفعہ پھر دوسری مرتبہ رہ رہ کر پھر تیسری بار
دیکھ نہیں سکتا جنگل میں کوئی ہمارا نقش پا — دیکھتے ہیں ہم اندھیرے میں سب کچھ ایسا ہی اپنی نگہ کا تار
تو بھی زباں زور اپنا دکھائے شور مچا کر چلا کر



شکاری اژدہا

ہے نازاں اگر اپنے خالوں پہ چیتا
اگر تم میں ہوگی صفائی کی عادت
شکاری وہی ہے زیادہ تناور
اگر سانڈ تم کو پٹخ دے اُٹھا کر
تو ہمّت نہ ہارو نہ جی چھوڑ بیٹھو
کرو غیر کے بچوں سے مت بُرائی
یہ ممکن ہے وہ ننھے اور بھدّی ہوں گو
جواں ہو کے نوخیز وحشی ہی کہتا
کہ مجھ سا تنومند کوئی نہیں ہے
مگر فخر یہ اُس کا بالکل ہے بے جا
اُسے چاہیئے ہوش اپنا سنبھالے

تو مغرور ہے اپنے سینگوں پہ ارنا
تو حاصل تمہیں ہوگا زور اور قوت
چمکتا رہے پوستیں جس کا اکثر
و یا تم کو زخمی کرے سخت سانبھر
مگر لپٹ جاؤ اپنے عدُو کو
اُنہیں سمجھو اپنے بہن اور بھائی
مگر اُن کی ماں اصل میں ریچھنی ہو
شکار اپنا جب مارتا ہے وہ پہلا
مرے سامنے دشت گھٹتا جبیں ہے
ہے جنگل بڑا اور وہ خود ہے چھوٹا
بلا سوچے سمجھے نہ بولے نہ چالے

(کپلنگ)

اِس فصل میں جو واقعات مندرج ہیں وہ اُس وقت سے کچھ مدت پہلے پیش آئے جبکہ راجہ مینڈک نے سیانی کے بھیڑیوں کے غول سے علیحدگی اختیار کی یا شیر خاں سے انتقام لیا۔ یہ اُس زمانہ کے واقعات ہیں جبکہ ریچھ اُسے جنگل کا قانون سکھاتا تھا۔ اس بھوری رنگت کے متین اور سنجیدہ اور قوی ہیکل جانور کو راجہ مینڈک جیسے ذکی اور فہیم شاگرد کے مل جانے سے بڑی خوشی حاصل ہوئی کیونکہ بھیڑئے کے بچے جنگل کا قانون اُسی حد تک سیکھتے ہیں جس حد تک کہ وہ اُن کے غول یا قوم سے متعلق ہے اور وہ یہ سبق یاد کرتے ہی بھاگ جاتے ہیں " ایسے دبے پاؤں چلو کہ آہٹ نہ ہونے پائے۔ آنکھیں ایسی روشن ہوں کہ اندھیرے میں سب کچھ نظر آجائے۔ کان ایسے تیز ہوں کہ بھٹ میں بیٹھے بیٹھے باہر کی ہوا کے جھونکوں کی خفیف سے خفیف سانس کی آواز سنائی دے سکے۔ اور دانت تیز اور سفید ہوں۔ یہ سب علامتیں طباقی گیدڑ اور لکڑ بھگے کو چھوڑ کر جن سے ہمیں نفرت ہے ہمارے بھائیوں کی ہیں " لیکن راجہ مینڈک چونکہ انسان کا بچہ تھا اس لئے اُسکو اور بھی بہت کچھ سیکھنا تھا۔ بعض دفعہ کالا چیتا اپنے دلارے کی ترقی کی حالت دیکھنے کے لئے جنگل میں ٹہلتا ہوا آتا اور کسی درخت کے تنے سے سر لگا کر راجہ مینڈک کا دن کا سبق جو وہ ریچھ کو سنا رہا ہوتا تھا۔ سنتا۔ راجہ مینڈک نے درخت پر چڑھنے اور تیرنے اور دوڑنے میں پوری مہارت حاصل کر لی تھی۔ اور ریچھ نے جو معلّم قوانین تھا اُسے جنگل اور پانی کے قانون سکھائے کہ کس طرح ایک بوسیدہ شاخ اور ایک مضبوط اور صحیح شاخ کا فرق دریافت کرنا چاہئے کس طرح جنگلی مکھیوں سے اُن کے چھتے کے قریب زمین سے پچاس فیٹ اوپر جا کر خلق آمیز گفتگو کرنی چاہئے۔ چمگادڑ سے دوپہر کے وقت شاخوں کے درمیان اُسکے آرام میں خلل اندازی کرتے وقت کس طریقہ پر معذرت کرنی چاہئے اور جوہڑ میں کودتے وقت پانی کے سانپوں کو کس طرح خبردار کرنا چاہئے۔ یہ باتیں ریچھ نے لڑکے کو اس لئے سکھائیں کہ جنگل کا کوئی جانور اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی اُس کے آرام میں خلل

اندازمی کرے اور سب کے سب مخل ہونے والے پر فوراً ہی حملہ کرتے ہیں۔اس کے علاوہ راجہ مینڈک کو ریچھ نے اجنبیوں کی شکاری دستک سکھائی۔جب کبھی کوئی جنگلی درندہ اپنی شکارگاہ کی حدود کے باہر شکار کرتا ہے تو اُس کے لئے ضرور ہے کہ یہ دستک باآوازبلند دے حتیٰ کہ اُس کا جواب اُس کو مل جاوے۔ وہ دستک یہ ہے "چونکہ میں بھوکا ہوں اسلئے مجھ کو یہاں شکار کرنے کی اجازت دو" اور اس کا جواب یہ ہے "اچھا شکار کرلو۔مگر پیٹ بھرنے کے لئے نہ کہ شوق اور تفریح کے واسطے"

اس سے ناظرین کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ راجہ مینڈک کو کس قدر سبق حفظ کرنا پڑتا تھا ایک ہی بات کو سوسو دفعہ دُہرانے سے وہ بڑا تنگ آگیا تھا اور اُس کو سخت محنت کرنی پڑتی تھی لیکن آدمی زاد ہونے کے باعث اُس کے لئے یہ محنت ضروری تھی چنانچہ ریچھ نے ایک دن جبکہ اُس نے لڑکے کو پیٹا اور وہ ناراض ہوکر بھاگ گیا چیتے سے کہا "آدمی کا بچہ آخر آدمی کا بچہ ہے۔اُسے جنگل کا پورا قانون سیکھنا چاہیے"

اس پر کالا چیتا جس نے اگر اُس کے بس میں ہوتا تو راجہ مینڈک کو بگاڑ دیا ہوتا خفا ہو بولا "لیکن یہ تو دیکھ کہ ابھی اُس کی عمر کس قدر کم ہے اُس کے ننھے سے سر میں تیری یاوہ سرائی کیسے سما سکتی ہے"

ریچھ نے جواب دیا "جنگل کا کوئی ایسا جانور نہیں جس کا شکار کرنا ایسا ہی آسان ہو جیسا کہ مُنہ کا نوالہ۔میں اسی لئے اُس کو یہ تمام باتیں سکھاتا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ اپنا سبق بھول جاتا ہے تو میں اُس کو ایک آدہ ہلکی سی چپت لگادیتا ہوں"

چیتا غرا کر بولا "ہلکی سی چپت! اے لوہے کے پنجوں والے بڈھے تو کیا جانے کہ نرمی کس جانور کا نام ہوتا ہے۔تیری ہلکی سی چپت نے اُس بیچارے کا چہرہ لہولہان کردیا ہے"

ریچھ نے نہایت وثوق سے کہا "بہتر ہے کہ میں جو اُسے عزیز رکھتا ہوں آج اپنے ہاتھ سے اُس کا تمام جسم سر سے لیکر پاؤں تک لہولہان کردوں بجائے اس کے کہ کل لاعلمی کی وجہ سے

اُسے کوئی ضرر پہنچے۔ میں اُسے آج کل جنگل کا اسم اعظم سکھا رہا ہوں جس کے یاد رکھنے سے وہ تمام پرندوں اور سانپوں اور اپنے غول کے علاوہ تمام چار پاؤں والے شکاری جانوروں سے محفوظ رہے گا۔ اگر وہ اِس اسم کو یاد رکھے تو تمام جنگل والوں سے وہ امان طلب کر سکتا ہے۔ کیا یہ تھوڑی سی مار کی کافی تلافی نہیں ہے؟"

چیتے نے جواب دیا "خیر تو اِس آدمی زاد کو کہیں مار نہ ڈالیو وہ کچھ درخت کا تنا نہیں ہے کہ تو اپنے کُند چنگال اُس پر تیز کرے۔ لیکن وہ اسم اعظم کیا ہے؟ میں تو خدا کے فضل سے بجائے مدد مانگنے کے دوسروں کو مدد پہنچانے کا دعویٰ رکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر چیتے نے اپنا ایک پنجہ پھیلایا اور اُس کے سرے پر فولاد کی سی نیلگوں رنگت کے چنگل کو اطمینان بھری نگاہ سے دیکھا اور بولا "خیر پھر بھی میں سُننا چاہتا ہوں کہ وہ اسمِ اعظم کیا ہے۔"

ریچھ نے کہا "میں راجہ مینڈک کو پکارتا ہوں۔ اگر وہ آگیا تو وہ یہ اسم اعظم تمہیں سُنائیگا چھوٹے بھیّا یہاں آؤ۔"

درخت کی چوٹی پر سے ایک رکھائی اور کدورت سے بھری ہوئی آواز یہ کہتی ہوئی سُنائی دی کہ میرا سر مکھی کے چھتے کی طرح بھنّا رہا ہے اور یہ کہہ کر راجہ مینڈک ایک درخت سے نہایت خفگی اور ناراضی کی حالت میں نیچے اُترا اور زمین پر پہنچ کر کہنے لگا "میں چیتے کے پاس آیا ہوں اے بھدّے بُڈھے ریچھ تیرے بُلانے پر میں کبھی نہ آتا۔"

ریچھ کو اپنے شاگرد کی اس بات سے گو کسی قدر صدمہ پہنچا لیکن اُس نے یہ جواب دیا۔ "خواہ تم کسی کے بُلانے پر آؤ میرے لئے سب یکساں ہے۔ اچھا اب چیتے کو جنگل کا وہ اسم اعظم تو سُنا دو جو میں نے آج تمہیں سکھایا ہے۔"

راجہ مینڈک نے اپنی علمیت کے اظہار کے شوق میں خوشی سے کہا "کن لوگوں کا اسم اعظم سُناؤں جنگل میں تو بہت سی زبانیں ہیں اور مجھے سب معلوم ہیں۔"

اس پر ریچھ بولا "تو کچھ تو جانتا ہے مگر سب کچھ نہیں جانتا۔ بھائی چیتے تم نے دیکھا یہ

شاگرد کبھی اُستاد کے ممنون نہیں ہوتے۔ ایک بھیڑیے کے بچے نے بھی کبھی آکر اپنے بڈھے اُستاد ریچھ کا شکریہ اُن باتوں کے لئے ادا نہیں کیا جو اُس نے چھوٹے ہوتے اُسے سکھائی تھیں۔ اچھا علامہ مینڈک صاحب ذرا شکاری جانوروں کے اسم اعظم کو تو دُہرا لیجئے"

راجہ مینڈک نے ریچھ کے لہجہ میں حرف بہ حرف اُن الفاظ کا جنہیں تمام شکاری جانور استعمال کرتے ہیں۔ اِس طرح اعادہ کیا۔

"ہم تمہارا اور ہمارا خون ہے ایک"

یہ سُن کر ریچھ نے کہا "اچھا اب پرندوں کا اسم اعظم سناؤ"

راجہ مینڈک نے اِسی فقرہ کو دُہرا کر آخر میں چیل کی طرح سیٹی بجائی۔

چیتے نے کہا "یہ تو ہو چکا اب سانپوں کا اسم اعظم سناؤ۔ جواب میں راجہ مینڈک نے سانپ کی طرح اس طرح پھنکار ماری کہ الفاظ کے ذریعہ سے اُسے ادا نہیں کیا جا سکتا یہ جواب دیکر اُس نے خوشی میں آکر تالیاں بجائیں اور اُچک کر چیتے کی پیٹھ پر جا بیٹھا اور دونوں پاؤں ایک طرف کر کے ڈھول کی طرح اُس کے پیٹ کو بجانے لگا۔ اور ریچھ کی طرف دیکھ دیکھ کر اُس کا مُنہ چڑانے لگا۔

ریچھ اُس وقت شفقت سے بولا "دیکھا مار کا اثر۔ تو نے کیا اچھا سبق یاد کیا۔ ایک دن وہ آئے گا جبکہ میرے احسان تجھکو یاد آئیں گے" یہ کہہ کر وہ چیتے کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اُس سے کہنے لگا "میں نے یہ تمام اسماء اعظم جنگلی ہاتھی سے جو ان میں پُورا ماہر ہے سیکھے تھے۔ البتہ سانپ کا اسم اعظم مجھے نہیں آتا تھا اور اُس کے سکھانے کے لئے ہاتھی راجہ مینڈک کو ایک بڑے تالاب پر لے گیا جہاں پانی کے ایک سانپ نے وہ اسم اس کو سکھا دیا۔ اب راجہ مینڈک جنگل کے تمام حوادث سے محفوظ ہے کیونکہ اب کوئی سانپ یا پرندہ یا درندہ اُسے ضرر نہیں پہنچائے گا غرضکہ اب اُسے کسی شے کا خوف نہیں ہے"

چیتے نے چپکے سے کہا "اُس کی اپنی قوم والے اُس سے مستثنےٰ ہیں" پھر بلند آواز

سے اُس نے راجہ مینڈک کو مخاطب کر کے کہا "بھیا میری پسلیوں کو کیوں توڑے ڈالتے ہو۔ یہ جو تم ناچ رہے ہو آخر اس کے کیا معنی ہیں"

راجہ مینڈک چیتے کی کھال کو شانے پر سے نوچ رہا تھا اور اُسے زور زور سے لاتیں مار رہا تھا تاکہ اُس کو اپنی طرف متوجہ کرے جب ریچھ اور چیتا دونوں اُس کی طرف متوجہ ہوئے تو اُنھوں نے زور سے یہ چلاتے ہوئے سُنا "میری اب اپنی ایک علیحدہ قوم ہو جائے گی اور میں دن بھر اُنہیں درختوں کی شاخوں میں لئے لئے پھرونگا"

چیتے نے یہ سُن کر کہا "میاں شیخ چلّی یہ نئی حماقت کیا ہے"

راجہ مینڈک چیتے کی بات سُنے بغیر اپنی کہے گیا "اور میں درختوں کی ٹہنیاں اور میل کچیل اوپر سے بڈھے ریچھ پر ڈالا کروں گا اُنہوں نے مجھ سے اس بات کا وعدہ کیا ہے۔ اہاہاہا اوہو ہو ہو۔

یہ سُنتے ہی ریچھ نے لڑکے کو ایک تھپڑ دیا اور وہ چیتے کی پیٹھ پر سے ریچھ کے دونوں اگلے پنجوں کے درمیان زمین پر آرہا۔ آنکھ اُٹھا کر اُس نے دیکھا تو اُسے معلوم ہوا کہ ریچھ نہایت ناراض ہے۔ پھر اُس نے چیتے کی طرف نگاہ بھر کر دیکھا کہ دیکھے وہ بھی خفا ہے یا نہیں لیکن اُس کی آنکھوں کو بھی اُس نے دہکتے انگاروں کی طرح پایا۔

اس وقت ریچھ نے اُس سے کہا "مینڈک تو بندروں کے پاس گیا تھا اُن سے تو نے باتیں کی تھیں۔ یاد رکھ کہ یہ وہ قوم ہے جو کسی قانون کو نہیں مانتی اور جو کچھ الا بلا پاتی ہے کھا پی جاتی ہے تیرے لئے یہ نہایت شرم کی بات ہے۔

راجہ مینڈک نے جو ابھی تک زمین پر چیت پڑا تھا جواب دیا "جب ریچھ نے پنجہ مار کر میرے سر کو زخمی کیا تو میں چلا گیا اور بھورے رنگ والے بندروں نے درختوں پر سے اُتر کر میری حالت پر رحم کیا۔ اُس وقت کسی دوسرے کو میری پروا نہ تھی۔ وہی تھے جنھوں نے میری خبر گیری کی۔

ریچھ غرّا کر بولا" بندر اور تجھ پر رحم کھائیں۔ اُن کا ترحّم ایسا ہی ہے جیسی پہاڑی نالے کی خاموشی یا گرمی کے موسم میں سورج کی سردی۔ اچھا اے آدمی زاد پھر کیا ہوا؟"

پھر یہ ہوا کہ اُنہوں نے مجھ کو میوہ اور دوسری عمدہ عمدہ چیزیں کھانے کو دیں اور ہاتھوں ہاتھ اٹھا کر مجھکو درختوں کی چوٹیوں پر لیگئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ تم ہمارے رشتہ کے بھائی ہوتے ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تمہارے دُم نہیں۔ ایک دن ہم تمکو اپنا سردار بنائیں گے"

اِس پر چیتے نے کہا" اُن کا کوئی سردار نہیں وہ جھوٹ بکتے ہیں اور ہمیشہ سے اُنکی یہی عادت چلی آئی ہے"

"وہ میرے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ تم پھر ہمارے پاس آنا۔ مجھ کو بندروں کے پاس پہلے کیوں جانے نہیں دیا گیا۔ میری طرح وہ بھی پاؤں کے بل کھڑے ہوتے ہیں۔ اپنے سخت پنجوں سے وہ مجھکو مارتے نہیں۔ دن بھر وہ کھیلتے رہتے ہیں۔ مجھکو اُٹھنے دے۔ ظالم ریچھ مجھکو کیوں اُٹھنے نہیں دیتا۔ میں اُن کے ساتھ پھر جا کر کھیلوں گا"

جب ریچھ نے یہ بات سُنی تو اُس کے غصہ کی کوئی حد نہ رہی اور وہ اِسطرح کڑک کر بولا جیسا کہ گرمی کی راتوں میں بادل گرجتا ہے" سن اے آدمی زاد! میں نے بندروں کے سوائے جو درختوں پر رہتے ہیں جنگل کے باقی تمام جانوروں کا قانون تجھکو سکھایا ہے۔ بندر کسی قانون کے تابع نہیں۔ وہ جنگل کی ذات برادری سے خارج ہیں۔ اُن کی اپنی کوئی بول چال نہیں بلکہ شاخوں پر بیٹھے ہوئے وہ دوسروں کی باتیں سُنتے ہیں اور اُنہیں کو چُرا کر خود استعمال کرتے ہیں۔ اُن کا دستور ہمارے دستور سے مختلف ہے۔ اُن کا کوئی سردار نہیں۔ حافظہ اُن کا ایسا ہے کہ کوئی بات اُنہیں یاد نہیں رہتی۔ شیخی وہ البتہ بگھارتے ہیں اور کلکلا کر دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم جنگل میں اپنی سلطنت قایم کر کے ایک انقلاب عظیم برپا کرنے والے ہیں مگر ایک پتّے کا کھٹکا ہوا کہ اُنہوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ اور سب کچھ

بھول گئے۔ ہم جنگل والوں سے اُن کا کوئی تعلق نہیں جس گھاٹ بندر پانی پیتے ہیں وہاں ہم نہیں پیتے۔ جہاں بندر جاتے ہیں وہاں ہم نہیں جاتے۔ جہاں وہ شکار کرتے ہیں۔ وہاں ہم نہیں شکار کرتے حتیٰ کہ اُن کے اور ہمارے مرنے کی جگہہ ایک نہیں۔ میری زبان سے تو نے آج سے پہلے کبھی بندروں کا ذکر سُنا بھی تھا۔"

راجہ مینڈک نے سہمی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا "نہیں۔"

ریچھ پھر بولا "جنگل والے بندروں کو دھیان میں بھی نہیں لاتے۔ تعداد میں بندر بہت ہیں لیکن سب کے سب نہایت بدمعاش اور ناپاک اور بے حیا ہیں۔ اُنکی اگر کوئی مستقل خواہش ہے تو وہ یہ ہے کہ جنگل کے لوگ اُن کی طرف توجہ کریں لیکن وہ ہمارے سروں پر درختوں کی ٹہنیاں اور غلاظت تک پھینکتے ہیں اور ہم پھر بھی اُن کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔"

ریچھ نے یہ بات ختم نہ کی تھی کہ اوپر سے اُس کے سر پر ٹہنیوں اور اخروٹوں کی ایک بوچھاڑ ہوئی اور بلندی پر اُس نے اور اُس کے ساتھیوں نے بندروں کے کھانسنے اور چیخنے اور ایک شاخ سے دوسری شاخ پر کودنے کی آواز سُنی۔

پھر ریچھ نے راجہ مینڈک سے کہا "بندروں کی قوم کو جنگل والوں سے ملنے اور اُن سے راہ و رسم بڑھانے کی ممانعت ہے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھو۔"

اس پر چیتا بولا "اس میں ذرا شک نہیں لیکن اے ریچھ تو نے بچہ کو اس بات سے پہلے ہی آگاہ کیوں نہیں کر دیا تھا۔"

ریچھ نے سر کھجا کر جواب دیا "بھلا مجھے یہ کیا معلوم تھا کہ تمہارا انوکھا بچہ بندروں جیسی گندی اور پلید شے کے ساتھ جا کر کھیلے گا۔ لاحول ولاقوۃ۔"

اس وقت ان کے سروں پر تازہ بوچھاڑ ہوئی اور ریچھ اور چیتا راجہ مینڈک کو ہمراہ لیکر وہاں سے اُٹھ کر بھاگے۔ ریچھ نے بندروں کے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ بالکل سچ تھا۔ چونکہ وہ درختوں کی چوٹیوں پر رہتے ہیں اور جنگلی درندے بہت کم آنکھ اُٹھا کر اوپر دیکھتے ہیں اس لئے بندروں کی جنگل والوں

سٹ بھیڑ نہیں ہوتی۔ لیکن بندر جب کبھی کسی بیمار بھیڑئے یا زخمی شیر یا ریچھ کو دیکھ پاتے ہیں تو اُسے دق کرتے ہیں اور ستاتے ہیں۔ اور جو درندہ درخت کے نیچے گذرتا ہے اُس پر دل لگی اور تماشا کے لئے اور اِس خیال سے بھی کہ اُس کی نگاہ اُن پر پڑے ٹہنیاں اور اخروٹ برساتے ہیں۔ پھر وہ چیختے اور چلاتے ہیں۔ اور جنگل والوں سے کہتے ہیں کہ اگر کچھ دعویٰ ہے تو آؤ درختوں پر چڑھ کر ہم سے لڑو۔ یا آپس میں بلاوجہ لڑنا شروع کر دیتے ہیں اور جو بندر ان خون ریز لڑائیوں میں مارے جاتے ہیں اُن کو ایسی جگہ ڈال دیتے ہیں جہاں جنگل والوں کی نگاہ اُن پر پڑ سکے۔ وہ ہمیشہ سے یہ کہتے چلے آئے ہیں کہ ہم عنقریب کسی کو اپنا سردار نامزد کریں گے اور اپنے لئے قوانین اور رسم و رواج کا ضابطہ مقرر کریں گے لیکن انہوں نے کیا ایسا کبھی نہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کا حافظہ نہایت ہی کمزور ہے۔ آج جو بات کرتے ہیں اُسے کل بھول جاتے ہیں۔ البتہ یہ کہہ کر وہ دل کو خوش کر لیا کرتے ہیں کہ جو بات ہم کو اب سوجھی ہے وہ دوسرے جنگل والوں کو کہیں برسوں میں جا کر سوجھے گی۔ کوئی جنگلی درندہ ان تک پہنچ نہیں سکتا تھا لیکن ساتھ ہی کوئی جنگلی درندہ اُنکی پروا بھی نہیں کرتا اور یہی وجہ تھی کہ جب راجہ مینڈک اُن کے ساتھ کھیلنے کے لئے آیا اور اُنہوں نے ریچھ کو ناراض ہوتے سُنا تو وہ بڑے خوش ہوئے۔

ان میں سے ایک بندر کے دل میں یکایک ایک خیال پیدا ہوا اور اُس نے اُسے نادر سمجھ کر دوسروں کے سامنے پیش کر کے کہا کہ اگر راجہ مینڈک ہماری قوم میں آ کر رہے تو ہمارے لئے وہ نہایت مفید ثابت ہوگا۔ کیونکہ وہ ٹہنیوں کو بُننا جانتا ہے جس سے ہم ہوا کے جھونکوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں اور اگر ہم اُسے پکڑ کر لے آئیں تو وہ ہم کو یہ ترکیب سکھا دے گا۔

راجہ مینڈک چونکہ ایک لکڑہارے کے گھر پیدا ہوا تھا اِس لئے موروثی طور پر فطرت نے اُس کی قوم کی عادتیں اور خصلتیں اُس میں منتقل کر دی تھیں۔ درختوں پر سے جو شاخیں گرتیں وہ بے سمجھے بوجھے اُن کو جوڑ کر چھوٹے چھوٹے مکان بنایا کرتا اور بندر درختوں پر سے یہ تماشا دیکھ کر اُس کو نہایت حیرت انگیز خیال کرتے۔ چنانچہ انہوں نے آپس میں کہا کہ اس دفعہ تو ضرور ہم اپنا ایک سردار مقرر کریں گے اور ہماری قوم جنگل بھر میں سب سے زیادہ عقلمند ہو جائے گی۔

اور دوسرے سب ہم کو رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ یہ سوچ کر وہ جنگل میں چپکے چپکے ریچھ چیتے اور راجہ مینڈک کے پیچھے ہو لئے۔ جب دوپہر ہوئی تو راجہ مینڈک جو نہایت تھک گیا تھا یہ ارادہ کر کے کہ اب میں بندروں سے کوئی تعلق نہ رکھونگا ریچھ اور چیتے کے بیچ میں پڑ کر سو گیا۔

جب وہ جاگا تو اُس نے اپنے آپ کو بندروں کی قید میں پایا جو اُس کے بازوؤں اور پاؤں کو اپنے تسمہ کے سے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے اسے لیکر درختوں پر چڑھ گئے تھے۔ اور ٹہنیوں کے پتے اُس کے منہ پر آ رہے تھے۔ گھبرا کر جو اُس نے نیچے نظر ڈالی تو ریچھ اور چیتے کو اُس نے دیکھا جو اب جاگ اُٹھے تھے اور اُسے بندروں کی قید میں دیکھ کر بیقرار ہو رہے تھے۔ ریچھ نے شور مچا کر تمام جنگل سر پر اُٹھا لیا اور چیتا جست بھر کر اپنا ہر ایک دانت کھولے درخت پر چڑھا۔ بندروں نے کامیابی کا ایک نعرہ مارا اور درخت کی چوٹی پر چڑھ گئے جہاں چیتا اُن تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اور وہاں اُنہوں نے چلا کر یہ کہنا شروع کیا "چیتے نے ہم کو دیکھ لیا۔ تمام جنگل والے ہماری چالاکی اور عیاری کی داد دے رہے ہیں"

اب اُنہوں نے بھاگنا شروع کیا۔ درختوں کی سرزمین میں بندروں کا پھلانگیں مارتے ہوئے بھاگنا بھی ایک نہایت ہی حیرت انگیز نظارہ ہے جسے کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ درختوں میں زمین سے پچاس سے لیکر سو فیٹ تک کی بلندی تک بندروں کے لئے سڑکیں۔ پگڈنڈیاں۔ دوراہے چڑھاؤ اور اُتار سب کچھ موجود ہے اور ضرورت پڑے تو رات کے وقت بھی وہ اِن راستوں سے سفر کر سکتے ہیں۔ دو سب سے زیادہ مضبوط بندروں نے راجہ مینڈک کو بازوؤں سے پکڑ لیا اور سات سات گز کی جست بھرتے ہوئے درختوں کو طے کرنے لگے۔ اگر وہ تنہا ہوتے تو اُن کی رفتار اس سے دونی تیز ہوتی۔ لیکن لڑکے کے بوجھ نے اُن کی سُرعتِ رفتار کو کم کر دیا تھا۔ اگرچہ راجہ مینڈک کا سر گھوم رہا تھا لیکن پھر بھی اس بے تحاشا دوڑ اور اُچھل کود سے اُسے بیحد لطف حاصل

ہوا۔ البتہ جب اتنی بلندی سے اُس کی نظر نیچے زمین پر پڑتی تھی تو اُس پر خوف چھا جاتا تھا اور ہر چھلانگ کے جھٹکے کے ساتھ اُس کا کلیجہ مُنہ کو آتا تھا۔ جو بندر اُس پر متعین تھے وہ اُسے لئے ہوئے پہلے تو درخت کی چوٹی پر چڑھ جاتے حتّٰی کہ پتلی پتلی شاخیں اُن کے بوجھ سے اتنی جُھک جاتیں کہ اُسے یہ گمان ہونے لگتا کہ یہ اب ٹوٹیں اب ٹوٹیں لیکن فوراً ہی کھکار اور للکار کر خلا میں آگے کو نیچے کی طرف اچک پڑتے اور دوسرے درخت کی نیچے کی شاخوں میں اپنے ہاتھوں یا پاؤں کے بل لٹک جاتے۔ بعض دفعہ اُس کی نگاہ دُور تک کام کرتی اور اُسے ہرے جنگل کا سہانا منظر میلوں تک اسی طرح پھیلا ہوا نظر آتا جس طرح کہ ایک ملاح کو جہاز کے مستول پر چڑھنے سے سمندر دور تک نظر آتا ہے اور بعض دفعہ ٹہنیاں اور پتے سائیں سائیں کرتے ہوئے اُس کے مُنہ کو رگڑتے اور وہ اور اُسکے دونوں پہرے والے گویا پھر زمین کی سطح کے قریب پہنچ جاتے۔ غرضکہ اس طرح چھلانگیں مارتے۔ دھما چوکڑی مچاتے للکارتے اور چیختے چلاتے تمام بندر راجہ مینڈک کو قید کئے درختوں کی راہ سے بھیجتے ہوئے چلے گئے۔

کچھ دیر تک اُس کو یہی خوف رہا کہ یہ مجھ کو نیچے گرادیں گے۔ تب اُسے بندروں کی اس حرکت پر بے اختیار غصہ آیا لیکن یہ وہ جانتا تھا کہ اس وقت ہاتھ پاؤں مار کر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنا بے فائدہ ہے۔ اس کے بعد اُس نے سوچنا شروع کیا کہ اس قید سے نجات پانے کے لئے کیا تدبیر اختیار کرنی چاہیئے۔ پہلی بات جو اُس کے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ ریچھ اور چیتے کو وہ اپنی حالت سے آگاہ کرے کیونکہ اُسکو خوب معلوم تھا کہ جس رفتار سے بندر جا رہے تھے وہ ایسی تیز تھی کہ اُس کے دوست بہت جلد پیچھے رہ جائیں گے۔ نیچے دیکھنا عبث تھا۔ کیونکہ شاخوں کے پتے اُس کی نگاہ کے حاجب تھے۔ اس لئے اُس نے آسمان کی طرف دیکھنا شروع کیا اور دیکھا کہ آسمان کے نیلے گنبد کے قریب چیل چکر کاٹتی ہوئی اُڑ رہی ہے اور اپنی تیز نظر جنگل پر چاروں طرف ڈال رہی ہے تا کہ موقعہ پاتے ہی اپنے شکار پر جھپٹا مارے چیل

نے بھی دیکھا کہ بندر کچھ چیز لئے جا رہے ہیں اور اس لئے وہ کئی سو گز نیچے اتر آئی تاکہ دیکھے کہ جو چیز وہ لئے جاتے ہیں وہ کھانے میں بھی اچھی ہوگی یا نہیں لیکن جب اُس نے راجہ مینڈک کو ان کی حراست میں پایا اور راجہ مینڈک نے پکار کر اس سے اس طرح مدد مانگی کہ

"ہمارا اور تمہارا خون ہے ایک"

تو چیل کو بے انتہا تعجب ہوا۔ اس وقت پتوں کی ایک لہر لڑکے کے سر سے گذر گئی اور وہ چیل کی نگاہ سے غائب ہوگیا۔ لیکن چیل نے آگے جا کر ایک دوسرے درخت کے اوپر اپنے آپ کو اپنے پروں پر تولے رکھا اور تھوڑی دیر میں راجہ مینڈک کا ننھا سا گندمی چہرہ درخت کی چوٹی پر پھر نمودار ہوا اور اس نے پکار کر چیل سے کہا "میرا کھوج مت چھوڑنا۔ اور سیانی کے غول والے ریچھ اور مجلس شوریٰ کے ٹبکرے والے چیتے سے یہ ماجرا کہہ دینا"

چیل نے اگرچہ راجہ مینڈک کا ذکر غائبانہ سنا تھا لیکن آج تک اُس نے لڑکے کو دیکھا نہیں تھا۔ اس لئے اُس نے پوچھا "بھائی یہ پیغام میں کس کی طرف سے دوں"

لڑکے نے جواب میں کہا "راجہ مینڈک کی طرف سے۔ مجھے آدمی کا بچہ کہہ کر پکارتے ہیں۔ سراغ کو دھیان میں رکھنا"

آخری لفظ لڑکے کے منہ سے اُس وقت نکلے جبکہ وہ ہوا میں قلابازی کھا رہا تھا۔ لیکن چیل نے اُس کا پیغام سن لیا اور سر سے اشارہ کر کے اس قدر بلند ہوئی کہ ایک ذرہ کی طرح نظر آنے لگی۔ اس بلندی پر سے اُس نے اپنی دوربین کی سی تیز آنکھیں راجہ مینڈک اور بندروں پر جو اسے لئے جا رہے تھے جمادیں اور قہقہہ لگا کر بولی۔

"زیادہ دور نہیں جائیں گے۔ بندروں کی ہمیشہ سے یہ عادت ہے کہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں اور جس کام کو شروع کرتے ہیں اُسے کبھی انجام کو نہیں پہنچاتے۔ لیکن اگر میری قوتِ فیصلہ غلطی نہیں کرتی تو اس مرتبہ بندروں نے اپنے آپ کو جان بوجھ کر ایک بڑی مصیبت میں پھنسا لیا ہے کیونکہ ریچھ غصہ میں آکر نہیں معلوم کیا آفت لائیگا اور چیتے کو تو

میں جانتی ہی ہوں کہ وہ نہایت ہی خونخوار ہے۔

غرضکہ چیل اوج ہوا پر پروں کو پھیلائے معلق رہ کر دیکھتی رہی کہ بندر کہاں جاتے ہیں۔ ادہر ریچھ اور چیتے کی حالت غم اور غصہ سے تباہ ہو رہی تھی۔ چیتا جہاں تک اُس سے درختوں پر چڑھا جا سکتا تھا چڑھا لیکن پتلی شاخیں اُس کے بوجھ سے جھک کر ٹوٹ گئیں اور وہ دھم سے زمین پر آگرا اور بیچارے ریچھ سے جو بندروں کو پکڑ لینے کی امید میں اُفتاں و خیزاں جا رہا تھا غرا کر بولا "ابے تو نے آدمی کے بچے کو اس سے پہلے خبردار کیوں نہیں کر دیا تھا تیری مار پیٹ سے کیا حاصل ہوا۔ افسوس کہ ہماری تمام محنت برباد گئی"

بیچارے ریچھ نے ہانپ کر جواب دیا "بھائی خدا کے واسطے جلدی کرو ممکن ہے کہ اب بھی ہم اُن کو جا لیں"

چیتا گھسیانا ہو کر بولا "اے قانون کے سکھانے والے اور بچوں کو زدوکوب کرنے والے! [illegible] ہاں ہاں اگر تو ایک میل اور اسی طرح سے لڑھکا تو تیرا یہ مٹکا سا پیٹ پھٹ جائیگا۔ بہتر یہ ہے کہ بیٹھ کر ذہن لڑا اور کوئی تجویز سوچ۔ اُن کے تعاقب کرنے کا موقعہ اب نہیں رہا۔ اگر ہم اُن کے قریب گئے تو ممکن ہے کہ وہ بچے کو نیچے گرا دیں۔

یہ سُن کر ریچھ نے کہا "ہائے افسوس! ممکن ہے کہ اُس کے بوجھ سے تھک کر اب بھی اُنہوں نے اُسے نیچے گرا دیا ہو۔ بندروں پر کسی کو کیا بھروسا ہو سکتا ہے۔ میں اس کا سزاوار ہوں کہ مرے ہوئے چمگادڑ میرے سر پر رکھے جائیں۔ مجھے کالی اور سڑی ہوئی ہڈیاں کھانے کو دی جائیں۔ مجھے جنگلی مکھیوں کے چھتوں میں ٹھونس دیا جائے حتیٰ کہ وہ ڈنگ مار مار کر میرا دم نکال دیں اور مجھے لکڑبگھے کے ساتھ گاڑا جائے کیونکہ میں کم بخت ناشدنی سب جانوروں سے زیادہ نابکار اور ناہنجار ہوں۔ ہائے افسوس! وائے افسوس! اے راجہ مینڈک میں نے بجائے تھپڑ مارنے کے تجھکو بندروں کی طرف سے کیوں متنبہ نہیں کر دیا۔ شاید تو اپنا سبق بھول گیا ہو اور جنگل میں اسم اعظم کی مدد کے بغیر اکیلا رہ جائے"

یہ کہکر ریچھ نے اپنے پنجے اپنے کانوں پر رکھ لئے اور کراہتا ہوا زمین پر اِدھر اُدھر لوٹنے لگا۔"

چیتے نے اپنی ساتھی کی یہ حالت دیکھ کر کہا "مجھے تو کچھ دیر ہوئی کہ اُس نے تمام اسم صحیح صحیح سُنا دیئے تھے۔ اے ریچھ تجھے خودداری کا خیال بھی ہے۔ آخر پاس وضع بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اگر میں کالا چیتا سیہ کی طرح گیند بن کر زمین پر لُڑھکنے لگوں اور چیخیں ماروں تو تمام جنگل والے کیا کہیں گے اور کیا سمجھیں گے۔"

ریچھ نے جواب دیا "مجھے جنگل والوں کی ذرا پروا نہیں۔ ہائے مجھے یہ خیال مارے ڈالتا ہے کہ اُس بیچارہ کا اب تک کہیں دم نہ نکل گیا ہو۔

چیتا اپنے اگلے پنجہ کو چاٹ کر اور کچھ سوچکر بولا "اگر وہ اُسے شاخوں پر سے نیچے گرا کر تماشے کے لئے اُسے مار ڈالیں تب تو دوسری بات ہے ورنہ آدمی کے بچے کی بابت مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ بڑا سیانا ہے اور ہر ایک بات جانتا ہے۔ اس کے علاوہ اُس کی آنکھیں ایسی ہیں کہ جنگل والوں میں سے کوئی اُن کے مقابلہ کی تاب نہیں لاسکتا اور سب کے سب اُن سے خوف کھاتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ بندروں کے قابو میں ہے جو درختوں پر رہنے کے باعث ہم لوگوں میں سے کسی سے نہیں ڈرتے۔

اِس وقت ریچھ نے زمین پر سے یکایک اُٹھ کر کہا "میں بھی کیسا احمق ہوں۔ میری عقل پر کیا چربی چھا گئی تھی جو میں نے جنگلی ہاتھی کے اس قول کو نظرانداز کر دیا کہ

"ہر کسے را بہر کارے ساختند"

بندروں کا کام تمام کرنے والا اژدہا ہے جو پہاڑوں میں رہتا ہے۔ بندر اگر درختوں پر چڑھ سکتے ہیں تو وہ بھی چڑھ سکتا ہے۔ رات کے وقت بندروں کے بچوں کو چرا لاتا ہے اور اژدہے کا نام سُنتے ہی اِن خبیثوں پر لرزہ چھا جاتا ہے چلو اژدہے کے پاس چلیں۔"

چیتے نے جواب دیا "وہ ہماری کیا مدد کرے گا؟ چونکہ وہ پاؤں نہیں رکھتا اس لئے اُس کا تعلق ہماری قوم سے تو ہے نہیں۔ اِس کے علاوہ اُس کی آنکھوں میں خبث کوٹ کوٹ کر

بھرا ہے "

ریچھ بولا "وہ بڑا خرانٹ اور مکار ہے۔ اور چونکہ اُس کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا اس لئے مجھے امید ہے کہ اگر اُسے کھانے کا لالچ دیا جائیگا تو وہ ضرور ہمیں کمک پہنچا ئیگا۔ تم اُسے بہت سی بکریاں دینے کا وعدہ کرنا "

چیتے نے جس کو اژدہے کے حالات سے زیادہ اطلاع نہ تھی شبہ کے لہجہ میں جواب دیا "وہ ایک دفعہ اپنا پیٹ بھر چکنے کے بعد ایک مہینہ تک سوتا رہتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اب بھی سویا ہوا ہو اور خواہ جاگتا بھی ہو تو کیا معلوم وہ اپنے لئے بکریاں آپ مار لے "

اس پر ریچھ نے چیتے کے کندھے سے اپنا بھدا کندھا رگڑ کر کہا "اگر ایسی صورت ہے تو ہم تم مل کر اُس کو ہیل سے قایل کرنے کی کوشش کرینگے "

غرضکہ دونوں اژدہے کی تلاش میں پہاڑ کی طرف چلے۔ دامنِ کوہ میں پہنچکر انہوں نے اُس کو ایک چٹان پر لیٹا ہوا پایا۔ اُس نے پچھلے دس دنوں میں اپنی کینچلی اُتاری تھی اور اُس وقت وہ اپنے خوبصورت اور چمکدار لباس کو جس پر رنگ برنگ کی چتیاں جواہرات کی طرح لگی تھیں سہ پہر کے آفتاب کی روشنی میں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ اُس کا چوڑا چکلا پھن زمین سے کسی قدر اُٹھا ہوا تھا اُس کا دس گز لمبا جسم پیچ و خم کھاتا ہوا لہرا رہا تھا۔ اور کھانے کے انتظار میں وہ اپنے ہونٹوں کو چاٹ رہا تھا۔ اُس کی زرد اور چمکیلی خوش نما کینچلی کو دیکھتے ہی ریچھ اطمینان کے ساتھ غرّایا اور بولا۔

"کھانا وانا اُسے کچھ نہیں ملا۔ بھائی چیتے ذرا ہوشیار رہنا کینچلی بدلنے کے بعد اسکی آنکھوں پر ہمیشہ تھوڑی سی چربی چھا جایا کرتی ہے۔ اور وہ دفعتہً حملہ کر بیٹھتا ہے "

یہ اژدہا زہریلا نہیں تھا۔ زہریلے سانپوں کو بزدل سمجھ کر وہ اُلٹا حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اُس کی طاقت اُس کی لپیٹ میں تھی۔ جب ایک دفعہ وہ اپنے شکار کے گرد زنجیر کی طرح لپٹ جاتا تھا تو اُس کی ہڈیاں توڑ کر بس اُس کا خاتمہ ہی کر ڈالتا تھا۔ ریچھ اپنے پچھلے پنجوں کے بل

ریچھ کرمچکارا "بھائی اژدہے شکار میں کامیابی تمہارے ساتھ ہو" اپنی نسل کے دوسرے سانپوں کی طرح اژدہا اونچا بہرا تھا۔ ریچھ کی آواز پہلی مرتبہ اُس نے نہیں سُنی لیکن دوسری مرتبہ جب ریچھ چلّا کر بولا تو اژدہے نے سر اُٹھا کر جواب دیا۔

"شکار میں کامیابی ہم سب کے ساتھ ہو - اخاہ- بھائی ریچھ تم یہاں کیا کر رہے ہو ؟ بھائی چیتے تم کو بھی خوب سا شکار میسر ہوا- غالبًا میری طرح تم بھی بھوکے ہو؟ کہو شکار کی کیا خبریں ہیں- کیا تمہیں امید ہے کہ کوئی ہرنی ہم کو یہاں قریب مل جائے گی یا ہرنی نہیں تو ہرن کا بچہ ہی سہی - بھوک کے مارے میری اِس وقت بُری حالت ہو رہی ہے "

ریچھ نے کہا " ابھی تو ہم شکار کو نکلے ہی ہیں۔"

اس پر اژدہا بولا " اگر تمہاری اجازت ہو تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں تم دونوں کے لئے شکار مار لینا کوئی بڑی بات نہیں لیکن مجھے تو جنگل میں کئی کئی دن انتظار میں گذر جاتے ہیں اور رات رات بھر درختوں پر چڑھتا رہتا ہوں تب کہیں جا کر کوئی چھوٹا سا بندر کا بچہ کھانے کو ملتا ہے اور وہ بھی اتفاقیہ طور پر- آج کل درختوں کی شاخیں ایسی مضبوط نہیں جیسی کہ اُس زمانہ میں ہوتی تھیں جب میں جوان تھا- اب تو جتنی ٹہنیاں ہیں سب کی سب خشک اور بوسیدہ ہیں-

اس کے جواب میں ریچھ نے اُس سے کہا " شاید تمہارے اس تن و توش کا اثر ہو اور شاخیں تمہارے غیر معمولی وزن کی متحمل نہ ہو سکتی ہوں "

یہ سُن کر اژدہا فخر سے تھوڑا سا تن گیا اور بولا " ہاں لمبائی میں تو میں کچھ کم نہیں ہوں لیکن پھر بھی سارا قصور اِن نئی شاخوں کا ہے پچھلی مرتبہ جب میں شکار کو نکلا تو چونکہ درخت کے گرد میری دُم مضبوط نہ لپٹی تھی اس لئے قریب تھا کہ میں نیچے گر پڑوں- میرے پھسلنے کی آواز سے "بندر لوگ" جاگ پڑے اور مجھ کو اُنہوں نے نہایت بُری گالیاں دیں "

اس پر چیتا بولا کہ وہ تم کو زمین پہ رینگنے والا بے پاؤں کلپیلا کیڑا کہتے تھے-

اژدہے نے یہ سُن کر ایک پھنکار ماری اور کہا کیا اُن حرام زادوں نے میری نسبت یہ

بات بھی کبھی کہی ہے۔"

چیتے نے اپنے شیریں لہجہ میں جواب دیا۔ "پچھلے مہینے کا ذکر ہے کہ ہم شکار کو جنگل میں جا رہے تھے کہ بندروں کے منہ سے ہم نے یہی بات سُنی وہ چلا چلا کر ہم کو سُنا رہے تھے مگر ہم نے اُن کی ذرا پرواہ کی۔ اُن کا کیا ہے اُن کے منہ جو آئے گا وہ بکیں گے۔ وہ تو یہ بھی کہینگے کہ تمہارے منہ میں ایک دانت نہیں رہا اور بکری کے بچہ سے جو چیز ذرا بھی بڑی ہوگی تم اُس کا مقابلہ نہ کروگے۔ کیونکہ تم بکرے کے سینگوں سے ڈرتے ہو۔ یہ بندر بھی کیسا ہی بے شرم اور شوخ ہیں۔"

سانپ اور پھر وہ بھی ایک پُرانا جہاندیدہ اژدہا اپنے غصّہ کو اکثر ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ لیکن چیتے نے جو فقرے کہے تھے وہ اشتعال اور برافروختگی کو کچھ ایسی تحریک میں لانے والے تھے کہ چیتے اور ریچھ نے اژدہے کے دونوں جبڑوں کو فرطِ غضب سے پھولتا ہوا دیکھا۔ بہرکیف اژدہے نے لہو کا گھونٹ پی کر اپنے غصہ کو ضبط کیا اور بولا۔

"بندروں نے اپنے رہنے کی جگہہ بدل دی ہے۔ آج جب میں دھوپ میں باہر نکلا تو میں نے اُن کو درختوں کی چوٹیوں پر چڑِ چڑ کرتے سُنا۔"

اِس کے جواب میں ریچھ نے کہا کہ ہم بندروں ہی کا تعاقب کر رہے ہیں۔ ریچھ کہنے کو تو یہ بات کہہ گیا لیکن بعد میں اُسے بڑی خجالت اور پشیمانی ہوئی کیونکہ اُسے یہ خیال پیدا ہوا کہ جنگل کے درندوں کے لیئے اِس امر کا مُعترف ہونا کہ اُنکو بندروں کی کسی حرکت سے دلچسپی ہے یا وہ اُنکی پرواہ کرتے ہیں نہایت ہی ذلت کا مقام ہے۔ اُس کا یہ خیال صحیح نکلا کیونکہ اژدہے نے متعجب ہو کر کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت ہی بڑی اہم بات ہے جس نے تمہارے جیسے دو شکاریوں کو جو میرے خیال میں جنگل میں اپنی اپنی قوموں کے سردار ہیں بندروں کی سُراغ برآری پر آمادہ کیا ہے" اژدہے کی اِس بات نے ریچھ کو تشویش میں ڈال دیا۔ لیکن چیتے نے فوراً ہی یہ جواب دیا۔

"بھائی اژدہے! بات اصل میں یوں ہے کہ یہ ناریلوں کے چرانے والے اور تاڑ کے پتوں کے چھیننے والے ہمارے آدمی کے بچے کو جس کا شاید تونے ذکر سنا ہو گا بھگا کر لے گئے ہیں"

اژدہا بولا "میں نے سیہی سے سنا تو تھا کہ ایک آدمی کا بچہ بھیڑیوں کے غول میں شریک کر لیا گیا ہے مگر میں نے اس کی بات کو باور نہیں کیا کیونکہ سیہی نہایت ہی ناقص اور غیر معتبر راوی ہے"

اِس کے جواب میں ریچھ نے کہا "سیہی نے جو کچھ تم سے بیان کیا ٹھیک تھا۔ یہ آدمی کا بچہ ایسا ہے کہ اس کی نظیر دنیا میں نہ ہو گی۔ نہایت ہی دانا۔ نہایت ہی دلیر اور نہایت ہی اچھا ہے۔ وہ خود میرا شاگرد ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ جنگل میں اپنے استاد ریچھ کا نام روشن کریگا اور اس کے علاوہ بھائی اژدہے مجھکو اور مجھکو ہی نہیں بلکہ چیتے کو اور دوسرے جنگل والوں کو اس سے محبت ہے"

اژدہے نے جھوم کر جواب دیا "عشق و محبت کے راز سے میں بھی ناآشنا نہیں۔ میں بھی تم کو ایسی حکایتیں سنا سکتا ہوں جو"

چیتا جلدی سے قطع کلام کر کے بولا "جو اس امر کی محتاج ہیں کہ مطلع صاف ہو۔ رات کا وقت ہو۔ چاندنی چھٹکی ہوئی ہو اور ہم سب کے پیٹ بھرے ہوئے ہوں تاکہ ہم اُن کی پوری داد دے سکیں۔ اِس وقت تو ہم اپنے آدمی کے بچہ کو بندروں کی قید سے چھڑانا چاہتے ہیں اور ہمکو خوب معلوم ہے کہ جنگل والوں میں اگر وہ کسی سے ڈرتے ہیں تو اژدہے سے"

اِس پر اژدہے نے کہا "مجھ سے نہ ڈریں گے تو اور کس سے ڈریں گے۔ بکی۔ جھکی۔ احمق بیہودہ! بیہودہ احمق۔ جھکی۔ بکی۔ کہیں کے! لیکن آدمی کا بچہ جو اُن کے قابو میں آگیا ہے اُسکی خیر نہیں۔ اُن کی تو یہ حالت ہے کہ جن ناریلوں کو وہ توڑتے ہیں اُن تک کو اکتا کے نیچے پھینک دیتے ہیں۔ دن دن بھر یہ ارادہ کر کے ایک شاخ لئے پھرتے ہیں کہ ہم اس سے طرح طرح کی چیزیں بنائیں گے۔ لیکن پھر اُسے توڑ کر دو ٹکڑے کر ڈالتے ہیں۔ اُس بیچارے آدمی زاد کی حالت قابل رشک نہیں۔ انھوں نے مجھکو پیلی مچھلی بھی کہا تھا نہ؟"

چیتے نے جواب میں کہا "تم ہی میں نہیں بلکہ زمین پر رینگنے والا کیڑا وہ تم کو کہتے تھے۔ اِس کے علاوہ انھوں نے تم کو بہت سی گالیاں دیں جنکو میں شرم کے مارے دُہرا نہیں سکتا"

اس پر سانپ پھنکار کر بولا "میں ان بدتمیزوں کو بتادوں گا کہ مالک کا نام ادب کے ساتھ لیا کرتے ہیں۔ دیکھ لینا میں نے بھی ان کو وہ سبق پڑھایا ہو کہ یاد ہی کریں۔ اب مجھے بتاؤ کہ بچے لیکر وہ کدھر گئے تھے؟"

ریچھ نے کہا "اِس کا حال جنگل ہی کو معلوم ہو۔ ہم کیا جانیں۔ جدھر سورج ڈوبتا ہے غالباً وہ اُدھر ہی گئے ہیں۔ بھائی اژدہے ہمارا تو خیال تھا کہ تم کو یہ بات معلوم ہوگی"

اژدہا بولا "مجھے بھلا کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ میرے تو جب وہ رستہ میں آجاتے ہیں تو میں اُن کو پکڑ لیتا ہوں ورنہ قصداً جا کر بندروں یا مینڈکوں کا میں شکار نہیں کیا کرتا۔ سسس"

اسوقت ایک آواز جس میں سیٹی کی سی گونج تھی یہ کہتی ہوئی سُنائی دی "اُلّو! اُلّو! اُلّو! سیانی کے بیٹوں کے غول والے ریچھ۔ اُٹھ۔ اُٹھ۔ اُٹھ۔ اُٹھ۔ اوپر دیکھ"

ریچھ نے اوپر دیکھا تو اُس نے چیل کو جس کے پھیلے ہوئے پروں پر غروب ہونیوالے آفتاب کی لاجوردی کرنیں چمک رہی تھیں اوج ہوا پر منڈلاتے پایا چیل کے سونے کا وقت قریب آگیا تھا۔ لیکن ریچھ کی تلاش میں جو گھنے درختوں کے پتوں میں چھپ جانے کے باعث اُسے نظر نہ آیا تھا اُس نے تمام جنگل چھان مارا تھا۔

ریچھ اُسے دیکھ کر بولا "کہو کیا ہے"

چیل نے کہا "میں راجہ مینڈک کو بندروں کی قید میں دیکھ آئی ہوں اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں یہ پیغام تم کو جا کر دوں۔ چنانچہ میں دیکھتی رہی کہ بندر اُسے کہاں لے جاتے ہیں۔ بندر اُسے دریا پار اپنے شہر میں جس کا نام ٹھنڈا بھٹ ہے لیگئے ہیں ممکن ہے کہ وہاں وہ ایک رات رہیں یا دس رات یا ایک گھنٹہ بھی نہ ٹھہریں۔ بہرحال میں چمگادڑ سے کہتی آئی ہوں کہ اندھیرے میں دیکھتا رہے بس میرا پیغام اسی قدر ہے۔ تم زمین کے رہنے والوں کو شکار میں کامیابی حاصل ہو"

یہ سنکر چیتا بولا "اے چیل تجھے پیٹ بھر کر کھانا ملے اور تیری نسل کی خیر ہو۔ جب میں شکار ماروں گا تو تجھ کو بھی یاد رکھوں گا اور کلیجہ تیرے لئے علیحدہ رکھ چھوڑوں گا۔ تو نے کیسی اچھی خبر ہم کو سنائی۔"

چیل نے جواب میں کہا "میں نے کوئی بڑا کام نہیں کیا۔ لڑکے کے پاس اسم اعظم موجود تھا۔ اور اس لئے میرا فرض تھا کہ میں اس کے حکم کی تعمیل کروں اور اُسے مدد پہنچاؤں۔" یہ کہہ کر وہ بلند ہوئی اور اپنے گھونسلے کی طرف چلی گئی۔

جب چیل اپنا پیغام سنا کر چلی گئی تو ریچھ فخر سے پکارا "دیکھا وہ اپنی زبان نہیں بھولا۔ اس چھوٹی سی عمر میں اُس کا پرندوں کے اسم اعظم کو یاد رکھنا اور وہ بھی ایسی حالت میں جبکہ بندر اُسے درختوں میں گھسیٹے لئے جا رہے تھے کتنی بڑی بات ہے۔"

چیتا بولا "اسم اعظم پوری طرح سے اس کے ذہن نشین ہو چکا تھا۔ واقع میں مجھ کو اس پر ناز ہے۔ اب چلو ٹھنڈے بھٹ کو چلیں۔"

اُس مقام کو یہ سب جانتے تھے لیکن جنگل والوں میں سے کبھی کوئی وہاں نہ جاتا تھا۔ کیونکہ جس مقام کا نام انہوں نے ٹھنڈا بھٹ رکھا تھا وہ ایک قدیم اجڑا ہوا شہر تھا جس کے کھنڈر جنگل میں رہ گئے تھے۔ اور جہاں انسان ایک دفعہ رہ چکا ہو وہاں درندے کم جاتے ہیں۔ جنگلی سور تو البتہ چلا جاتا ہے لیکن شکاری جانور نہیں جاتے۔ اس کے علاوہ یہ مقام بندروں کی بھی جائے سکونت نہ تھا۔ وہ جس طرح دوسری جگہ رہتے تھے اُسی طرح یہاں بھی چلے آتے تھے اور اس لئے کوئی جانور جس کو ذرا بھی خودداری کا خیال تھا ان کھنڈروں میں قحط کے موسم کے سوا جبکہ وہاں کے ویران اور ٹوٹے ہوئے تالابوں اور حوضوں میں کسی قدر پانی موجود ہوتا تھا نہیں آتے تھے۔

چیتے نے کہا "اگر ہم پوری رفتار سے گئے تو آدھی رات میں سفر طے ہو گا۔"

ریچھ نے متفکر ہو کر جواب دیا "مجھ سے جس قدر تیز ممکن ہوا چلوں گا۔"

چیتا بولا "ہم تیز نہیں چل سکتے تو ہمارے پیچھے پیچھے چلے آئیں اور اژدہا قدم بڑھائے ہوئے جائیں گے "۔

اِس کے جواب میں اژدہے نے پھنکار مار کر کہا "قدم ودم تو میں جانتا نہیں مگر باوجود کہ تیرے چار پاؤں ہیں پھر بھی تجھ کو پیچھے چھوڑ سکتا ہوں "۔

یہ کہہ کر وہ روانہ ہوئے۔ ریچھ نے تیز تیز چلنے کی کوشش کی مگر کچھ دور جا کر وہ ہانپتا ہوا بیٹھ گیا۔ اور وہ اُسے چھوڑ کر آگے بڑھے۔ چیتے نے لمبی لمبی پھلانگیں مارنی شروع کیں۔ مگر باوجود اُس کی اس تمام تیزی کے پہاڑی اژدہا برابر اُس کے ساتھ ساتھ رہا۔ ایک ندی پر پہنچ کر چیتا اژدہے سے کچھ آگے بڑھ گیا کیونکہ وہ تو جست بھر کر اُس پر سے کود گیا اور اژدہے کو تیرنا پڑا۔ لیکن ہموار زمین پر اژدہے نے اس فرق کی تلافی کر دی جست پٹنے کے وقت اژدہے کی یہ تیز رفتاری دیکھ کر چیتا بولا "قسم ہے مجھ کو اسی ٹوٹے تالے کی جس کی بدولت مجھے آزادی ملی کہ تیری چال کچھ کم نہیں ہے"

اس پر اژدہا بولا "مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ اسکے علاوہ اُنہوں نے مجھکو چتی دار مینڈک کہا تھا"

چیتے نے کہا "اور زمین پر رینگنے والا پیلا کیڑا بھی کہتے تھے "۔

اژدہے نے جواب دیا "ایک ہی بات ہے چلو قدم اُٹھاؤ" یہ کہہ کر اُس نے اور بھی زیادہ تیزی سے آگے کی طرف جھپٹنا شروع کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ایک سیل ہے کہ بہی چلی جا رہی ہے۔

ٹھنڈے بھٹ میں بندروں کو راجہ مینڈک کے دوستوں کا خیال تک نہ تھا وہ لڑکے کو اُس ویران شہر میں لے آئے تھے اور اپنے اس نمایاں کارنامہ پر فخر کر رہے تھے۔ راجہ مینڈک نے اس سے پہلے ہندوستان کا کوئی شہر کبھی نہ دیکھا تھا اور اگرچہ ٹھنڈے بھٹ کے کھنڈر ہی کھنڈر باقی تھے پھر بھی اُس کے لئے یہ ایک حیرت انگیز اور عالی شان نظارہ تھا۔ مدت ہوئی کہ کسی راجہ نے ایک چھوٹی سی پہاڑی پر اس شہر کی بنا ڈالی تھی۔ ابھی تک پتھر کی سڑکیں شہر کے پھاٹکوں تک جن کے بوسیدہ چوبی پٹ زنگ آلودہ قبضوں میں اٹکے ہوئے تھے بنی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ دیواریں

کی دروں اور دراڑوں میں درخت اُگ آئے تھے۔ فصیل گر کر ٹوٹ گئی تھی اور جنگلی بیلیں برجوں کی کھڑکیوں میں سے نکل کر دیواروں پر سرنگوں لٹک رہی تھیں۔

پہاڑی کی چوٹی پر ایک بہت بڑا محل کھڑا تھا۔ جس کی چھت گر گئی تھی۔ صحن اور اُس میں جو حوض تھے اُن کا سنگ مرمر ٹوٹ گیا تھا اور جس چوک میں راجہ کے ہاتھی کھڑے رہتے تھے اُس کے پتھر بھی اُکھڑ گئے تھے اور وہاں گھاس اور درخت اُگ آئے تھے۔ محل پر کھڑے ہو کر بے چھت کے مکانوں کی قطاریں دور تک نظر آتی تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ گویا شہد کے خالی چھتے ہیں جن میں سیاہی بھری ہے۔ چور اہے کے چوک میں پتھر کا ایک تودہ جو کسی زمانہ میں تراشی ہوئی مورت ہو گی رکھا تھا۔ گلیوں کے کناروں پر جا بجا گڑھے اور نشیب تھے جو کبھی کنوئیں اور باولیاں ہوتی ہونگی۔ اور مندروں کے ٹوٹے ہوئے قبوں کی درزوں میں سے جنگلی انجیر کے پودے نکلے ہوئے تھے۔ بندر اِس مقام کو اپنا شہر کہتے تھے۔ اور دوسرے جنگل والوں کو یہ کہہ کر حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ وہ بن کے رہنے والے ہیں۔ لیکن خود وہ یہ نہ جانتے تھے کہ اِن عمارتوں کے بنائے جانے کا مقصد کیا تھا یا اُنہیں کس طرح استعمال کرنا چاہیے۔ کبھی تو وہ راجہ کے دیوان خانہ میں بیٹھ کر اپنے بدن کو اس طرح کھجاتے کہ گویا کسی پسّو یا کھٹمل نے اُنہیں کاٹا ہے۔ اور اِس طرح کی حرکتیں کرتے کہ گویا وہ آدمی ہیں۔ اور کبھی چونے اور پتھر کے ٹکڑے اور کوئی قدیم چیز جو اُنہیں مکانوں میں پڑی مل جاتی تھی اُٹھا کر کسی جگہ چھپا دیتے لیکن جس جگہ اِن چیزوں کو چھپایا تھا اُسے بھول کر آپس میں شور مچاتے اور چڑچڑ کرتے ہوئے لڑنے لگتے اور پھر بھاگتے ہوئے راجہ کے باغ میں جاتے اور وہاں گلاب اور نارنگیوں کے پودوں کو زور سے ہلاتے اور پھولوں کی پنکھڑیوں اور میووں کو زمین پر گرتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتے اور ناچتے۔ وہ محل کی غلام گردشوں اور چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں میں جن کی تعداد کئی سو ہو گی پھرتے لیکن اُن کو یہ کبھی نہ یاد رہتا کہ ہم نے کیا دیکھا ہے اور کیا نہیں دیکھا۔ غرض اسی طرح وہ ایک ایک دو دو کر کے چکر لگاتے اور کہتے کہ ہمارے اوضاع و اطوار اور حرکات و سکنات بھی انسانوں کے سے ہیں۔ حوضوں اور تالابوں کے کنارے جا کر وہ پانی پیتے اور اُسے کھنگال کر گدلا کرتے اور پھر اُس پر لڑتے جھگڑتے اور چلاتے ہوئے

چلاتے ہوئے دیواروں پر چڑھ جاتے کہ جنگل والوں میں عقلمندی نیکی چستی وچالاکی۔ طاقت اور شرافت کے لحاظ سے کوئی بندروں کا ہمسر نہیں۔ پھر وہ پہلے کی طرح دھما چوکڑی مچاتے یہاں تک کہ اُن کی طبیعت شہر سے اُکتا جاتی اور اس امید میں کہ جنگل والے اُن کی طرف متوجہ ہوں گے وہ درختوں کی چوٹیوں پر چڑھ جاتے۔

راجہ مینڈک کو جس نے جنگل کے قانون کے مطابق تربیت پائی تھی یہ طرزِ زندگی پسند نہیں آیا اور نہ وہ یہ سمجھ سکا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ آفتاب کے غروب کا وقت قریب تھا کہ بندر اُسے گھسیٹ کر ٹھنڈے بہٹ میں لے آئے اور اتنے بڑے لمبے سفر کی تکان کے بعد سو جانے کے بجائے جیسا کہ راجہ مینڈک نے کیا ہوتا وہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ناچنے اور اپنے مہمل گیت گانے لگے۔ ایک بندر نے اُٹھ کر تقریر کی اور اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا "اس آدمی زاد کا گرفتار کرنا ہماری قوم کی تاریخ میں ایک نیا واقعہ ہے کیونکہ یہ آدمی کا بچہ ہمیں ٹہنیوں اور شاخوں کو بننا اور جوڑنا سکھائیگا جس سے ہم مینہ اور سردی سے محفوظ رہیں گے" یہ سن کر راجہ مینڈک نے کچھ بیلوں کے لمبے لمبے ڈنٹھل اُٹھائے اور اُن کو گوندھنا شروع کیا۔ بندروں نے بھی اُس کی دیکھا دیکھی کچھ پتلی پتلی شاخیں اُٹھالیں اور اُس کی نقل کرنے لگے لیکن ایک منٹ بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ اس کام سے جو دلچسپی اُن کو تھی وہ کافور ہو گئی اور اُنہوں نے ایک دوسرے کی دُم کو کھینچنا اور قلابازیاں لگانا اور کھنکارنا شروع کر دیا۔

اس وقت راجہ مینڈک نے اُن سے کہا "مجھے بھوک لگ رہی ہے جنگل کے اس حصہ میں میں بالکل اجنبی ہوں۔ اس لئے یا تو مجھ کو کھانا لادو اور یا مجھ کو اجازت دو کہ خود اپنے لئے شکار مار لاؤں۔"

یہ سنتے ہی بیس تیس بندر دوڑ پڑے تاکہ جنگل کے پھل اپنے نووارد مہمان کے لئے لائیں لیکن اُنہوں نے راستہ میں ایک دوسرے سے لڑنا شروع کر دیا اور جو میوہ اُن کی باہمی چپقلش سے بچ رہا تھا اُسے بمشکل تمام وہ ٹھنڈے بہٹ تک لائے۔ راجہ مینڈک غصہ کے مارے دانت

چیں رہا تھا اور بھوک کی شدت اُسے بیتاب کئے ڈالتی تھی مگر اُس سے کچھ بن نہ پڑتا تھا۔ ویران شہر میں کچھ کچھ دیر کے بعد اجنبیوں کی شکاری دستک دیتا ہوا وہ اِدھر اُدھر پڑا بھٹکتا تھا مگر جواب کہیں سے نہ آتا تھا۔ یہ حالت دیکھکر لڑکا دل میں کہنے لگا "واقعی میں بُری جگہ پھنسا۔ بندروں کی نسبت ریچھ نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا اُس کا حرف حرف سچ ہے۔ یہ نالائق نہ کسی قانون کے تابع ہیں نہ اُن کی کوئی شکاری دستک ہے اور نہ ان کا کوئی سردار ہے۔ بیہودہ بکواس کرنے اور چیزیں چُرانے کے سوائے اور انہیں کچھ نہیں آتا۔ پس اگر فاقوں کے مارے میرا یہاں دم نکل گیا یا خود انھوں نے مجھے مار ڈالا تو اس میں سراسر میرا ہی قصور ہے اور کسی کی کچھ خطا نہیں۔ لیکن مجھے اپنے جنگل میں واپس جانے کے لئے ہاتھ پاؤں تو مارنے چاہئیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہاں پہنچتے ہی ریچھ مجھ کو خوب پیٹیگا مگر اُس کی مار اس سے بہتر ہے کہ میں یہاں بندروں کی صحبت میں رہ کر اڑتی گلاب کی پتیوں کے پیچھے دوڑا کروں۔

یہ قصد کر کے وہ اُٹھا اور شہر پناہ کی طرف بڑھا لیکن زیادہ دور نہ جانے پایا تھا کہ بندر اُسے کشاں کشاں واپس لے آئے اور چٹکیاں لیکر اُس سے کہنے لگے کہ تم جس قدر خوش و خرم یہاں رہ سکتے ہو۔ اتنے کہیں اور نہیں رہ سکتے۔ بیچارہ راجہ مینڈک غم و غصہ کھا کر چُپ رہ گیا اور طوعاً و کرہاً بندروں کے ساتھ ہو لیا جو اُسے ایک چبوترہ پر لیگئے یہ چبوترہ سنگ سرخ کے اُن حوضوں کے قریب واقع تھا جو مینہ کے پانی سے آدھے بھرے ہوئے تھے اور اُس کے بیچوں بیچ سفید سنگ مرمر کا ایک شہ نشین جس میں صدہا سال پہلے رانیاں آکر بیٹھتی ہونگی بنا تھا۔ اِس شہ نشین کی چھت آدھی گر پڑی تھی جس کی وجہ سے وہ زمیں دوز رستہ جس سے ہو کر رانیاں محل میں سے یہاں آتی تھیں پٹ گیا تھا لیکن دیواریں ابھی تک پوری کھڑی تھیں۔ اِن میں دودھ کے سے سفید سنگ مرمر کی جالی کا کام تھا۔ اور ان جالیوں میں یشب۔ عقیق۔ زبرجد اور لاجورد کی دلفریب پچی کاری ہو رہی تھی۔ جالیوں میں سے جب چاندنی چھن کر زمین پر پڑتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا سیاہ مخمل کا فرش بچھا ہے۔ جس پر سفید ریشم کی گلکاری ہو رہی ہے۔

اگرچہ راجہ مینڈک پر تکان نیند اور بھوک کا غلبہ تھا لیکن اُس سے ہنسے بغیر نہ رہا گیا جب بندروں نے ایک ساتھ مل کر اُسے مخاطب کر کے یوں چلّانا شروع کیا "ہم بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ ہم آزاد و خود مختار ہیں۔ ہمارے کارنامے حیرت انگیز ہیں جنگل بھر میں ہم فرد ہیں۔ اور چونکہ ہم سب کا یہ دعویٰ ہے۔ اس لئے ہمارا دعویٰ لامحالہ سچ ہونا چاہئے۔ چونکہ تم نے ہماری باتیں پہلے پہل سُنی ہیں اور تم جنگل کے لوگوں کو یہ باتیں جا کر سُنا سکتے ہو جس سے وہ آیندہ ہماری طرف متوجہ ہوں گے اس لئے ما بدولت تم کو اپنے سب حالات سے اطلاع دینگے"

راجہ مینڈک نے اِس کا کچھ جواب نہیں دیا۔ اب سینکڑوں بندروں نے چبوترہ پر جمع ہو کر اپنے خطیبوں کی تقریروں کو سُننا شروع کیا جو اپنی قوم کی تعریف میں نہایت جوش سے رطب اللسان تھے۔ جب کوئی مقرر دم لینے کے لئے ذرا رکتا تو وہ سب کے سب چلّا اُٹھتے "درست ہے۔ صحیح ہے۔ چونکہ ہم سب کا یہی دعویٰ ہے اس لئے یہ دعویٰ سچا ہے" راجہ مینڈک سے جب وہ کوئی سوال کرتے تو وہ سر ہلا کر "ہاں" کہہ دیتا۔ مگر بندروں نے بھی اتنا شور مچایا اور اتنا چلّائے کہ بیچارے راجہ مینڈک کا سر پھٹنا اُٹھا۔ دق ہو کر وہ آپ ہی آپ بولا "معلوم ہوتا ہے کہ طباقی نے اِن سب کو کاٹ کھایا ہے۔ اِن کے دیوانہ ہونے میں کیا شک ہے کبھی یہ سوتے بھی ہیں؟ اہلو! چاند بادل کے ایک ٹکڑے میں چھپ گیا۔ اگر یہ ٹکڑا ذرا بڑا ہوتا تو میں اندھیرے میں بھاگ جانے کی کوشش کرتا"

اسی بادل کو راجہ مینڈک کے دو وفادار دوست اُس کھائی میں جو شہر پناہ کے گرداگرد تھی چھپے ہوئے دیکھ رہے تھے کیونکہ چیتے اور اژدہے کو یہ بات معلوم تھی کہ جب بندروں کی تعداد زیادہ ہو تو وہ بڑے خطرناک ہوتے ہیں اور اس لئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ کے خطرہ میں ڈالیں۔ بندر اُس وقت تک نہیں لڑتے جب تک کہ ایک کے مقابلہ میں اُن کی تعداد سو نہ ہو اور جنگل والوں میں سے کسی کا یہ حوصلہ نہیں پڑتا کہ ایسے کثیر التعداد غنیم سے نبرد آزمائی کرے۔

اژدہے نے چپکے سے کہا۔ میں مغربی دیوار کی طرف جاتا ہوں۔ اُدھر سے زمین ڈھلوان ہے اور میں جھپٹ کر بندروں کو آلونگا۔ ایسی حالت میں اُن کا سو سو کا جتھا بھی میری پیٹھ پر چڑھکر مجھے ضرر نہ پہنچا سکے گا۔"

چیتے نے جواب دیا۔ "تم نے بالکل ٹھیک بات کہی۔ کاش ریچھ اس وقت یہاں ہوتا۔ مگر خیر ہم سے جو کچھ ہو سکتا ہے ہم کرینگے۔ جب وہ بادل کا ٹکڑا چاند پر چھا جائیگا تو میں چبوترہ کی طرف جاؤنگا۔ وہاں وہ لڑکے کو لئے ہوئے کوئی مشورہ کر رہے ہیں۔"

اژدہا لہراتا ہوا مغربی دیوار کی طرف بڑھا۔ رستہ میں کھنڈر جا بجا بکھرے پڑے تھے اور اس لئے دیوار پر چڑھنے میں اُسکو کچھ دیر لگ گئی۔ اس وقت چاند بادل میں چھپ گیا اور راجہ مینڈک نے چبوترہ پر چیتے کی پاؤں کی آہٹ سُنی۔ کالے چیتے نے جو پھرتی سے دبے پاؤں چبوترہ پر آپہنچا تھا بندروں کو جو پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ کے جھنڈ میں راجہ مینڈک کے گرد بیٹھے ہوئے تھے دائیں بائیں تھپڑ مار مار کر گرانا شروع کیا۔ فرط خوف و غضب سے بندروں نے ایک شور برپا کیا لیکن جب چیتا زخمی اور سسکتے ہوئے بندروں پر سے کودتا ہوا آگے بڑھا تو ایک بندر چلایا۔ "صرف ایک ہی ہے صرف ایک ہی۔" "مار ڈالو اسکو پکڑ لو جانے نہ پائے۔" یہ سُنتے ہی بندروں کا ایک جم غفیر چیتے کو لپٹ گیا اور رکن کے ایک شاعر کے قول کے مطابق اُنہوں نے

" کاٹیدن و نوچیدن و برآنگ پڑیدن "

شروع کیا۔ ادھر پانچ چھ بندروں نے مل کر راجہ مینڈک کو پکڑ لیا اور اُسے گھسیٹتے ہوئے گنبد نشین کی دیوار پر لے چڑھے اور اُس کے ٹوٹے ہوئے قبے کے روزن میں سے اُسے نیچے گرا دیا اگر کسی لڑکے کی انسانوں میں تربیت ہوئی ہوتی تو اُسے بڑی چوٹ لگتی کیونکہ جس مقام پر سے وہ گرایا گیا تھا وہ زمین سے پانچ گز بلند تھا لیکن راجہ مینڈک اُس طرح گرا جیسے ریچھ نے اُسے سکھایا تھا اور زمین پر پاؤں کے بل آرہا۔ بندروں نے چلا کر کہا "یہیں ٹھہرا رہ ہم جا کر تیرے دوستوں کا صفایا کرتے ہیں اور اگر اُس وقت تک ماہنوں نے تجھے زندہ چھوڑا

تو پھر ہم تجھ سے آکر کھیلیں گے۔"

راجہ مینڈک نے سانپوں کا اسم اعظم فوراً یہ کہہ کر پڑھا۔

"ہمارا اور تمہارا خون ہے ایک"

اس کے ساتھ ہی سانپوں کے پھنکارنے کی آواز اس نے سُنی اور دوبارہ اپنی دستک دی۔ ہندوستان میں ہر ویرانہ سانپوں کا مسکن بنجاتا ہے چنانچہ قدیم شہ نشین میں بھی اسی لحاظ سے پھن دار سانپوں کی بانبیاں جا بجا موجود تھیں۔ راجہ مینڈک کی دستک سنتے ہی چھ سات سانپوں نے جواب میں کہا "بھیا ایک جگہہ چپ چاپ کھڑے ہو جاؤ کہیں ہم کو اپنے پاؤں سے سل نہ دینا۔"

راجہ مینڈک ایک جگہہ جم کر کھڑا ہو گیا اور باہر سے بندروں کے چیخنے اور چلانے اور چیتے کے ڈکارنے کی جو آوازیں آرہی تھیں اُن کو کان لگا کر سُننے لگا۔ چبوترے پر واقع میں ایک عجیب ہنگامہ برپا تھا۔ بندروں کا ایک دل بادل اُسے ڈراتا تھا اور چیتے پر پل پڑتا تھا۔ مگر چیتا بھی بجلی کی طرح کوندتا تھا اور ہر تڑپ میں پانچ چھ بندروں کو زمین پر لٹا دیتا تھا۔ لیکن آخر کہاں تک لڑتا۔ اس کشمکش عظیم کے بعد اُس نے ہانپنا شروع کیا۔ چیتے کے لئے اپنی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ اپنی جان عزیز کی خاطر جان توڑ کر لڑ رہا تھا۔

راجہ مینڈک نے دل میں خیال کیا کہ ریچھ بھی قریب ہی ہوگا۔ کیونکہ چیتا اکیلا کبھی نہ آیا ہوگا یہ سوچکر وہ بہ آواز بلند پکارا "بھائی چیتے تالاب کا رُخ کر کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ اور پانی میں کود پڑ۔ فوراً پانی کے حوضوں کی طرف جھپٹ۔"

چیتے نے اس آواز کو سُنا اور جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ راجہ مینڈک صحیح وسلامت موجود ہے تو اُس کی ہمت اور بڑھ گئی۔ وہ لڑتا بھڑتا اور جدوجہد کرتا سیدھا تالاب کی طرف گیا۔ اُس وقت ویران شہر پناہ کے اُس حصہ سے جہاں سے جنگل سب سے زیادہ قریب تھا ریچھ کے نعرے کا شور بلند ہوا۔ بڈھے ریچھ نے منزل کے طے کرنے میں جان لڑا دی

تھی مگر باوجود اس تگ و دو کے وہ پھسلے نہ پہنچ سکا۔ وہ کڑک کر بولا "چیتے حوصلہ رکھ میں آن پہنچا۔ میں دیوار پر چڑھ رہا ہوں۔ پتھر میرے پاؤں تلے پھسلے جا رہے ہیں۔ کھڑے رہو اے خبیث لنگورو بچو دیکھو تو سہی تمہیں آکر کیا مزا چکھاتا ہوں۔" ریچھ ہانپتا ہوا چبوترہ پر آنمودار ہوا اور بندروں کی ایک موج گوناگوں نے اسے سر تک چھپا دیا لیکن وہ بھی اپنے پچھلے پنجوں کے بل جم کر کھڑا ہو گیا اور اپنے اگلے پنجے پھیلا کر اس نے جس قدر بندروں کو ہو سکا اپنے بغل میں ایسا دبایا کہ ان کا کچومر نکل گیا۔ پھر اس نے اپنے حریفوں پر تڑا تڑ تھپڑ برسانے شروع کئے اور دائیں بائیں مردہ اور زخمی بندروں کا ڈھیر لگ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کوئی لوہار سندان پر پیاپے ہتوڑے مار رہا ہے۔ اس وقت راجہ مینڈک کو کسی شے کے دھڑام سے پانی میں گرنے کی آواز آئی اور اسے معلوم ہوا کہ چیتا لڑتا بھڑتا تالاب کے کنارہ پر پہنچکر پانی میں کود پڑا ہے جہاں بندر اس کے پاس نہیں آسکتے۔ چیتے کی سانس پھول رہی تھی اور اس کا سر پانی کی سطح سے ذرا اوپر تھا۔ بندر تین قطاروں میں تالاب کے کنارہ سرخ پتھروں پر کھڑے ہوئے جھلا رہے تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ اگر وہ ریچھ کی مدد کے لئے پانی سے باہر نکلے تو اس پر فوراً ہی حملہ کریں۔ اس وقت چیتے نے اپنی ٹھوڑی کو جو پانی میں تر تھی اوپر اٹھا کر مایوسی کے عالم میں اژدہے سے اس کی قوم کا یہ اسم اعظم پڑھ کر کہ

"ہمارا اور تمہارا خون ہے ایک"

امان طلب کی۔ چیتے کو یہ گمان تھا کہ اس آخری وقت میں اژدہے نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔

اژدہا مغربی دیوار کو طے کر کے ابھی ابھی نیچے اترا تھا۔ اس نے ایک دو دفعہ کنڈلی ماری اور پھر اپنے جسم کو سیدھا کیا تاکہ اس بات کا اسے اطمینان ہو جائے کہ اس کے جسم کا ہر ایک پرزہ صحیح و مستعد حالت میں ہے۔ اس اثنا میں ریچھ اور بندروں کی لڑائی بدستور جاری تھی۔ دوسری طرف بندر تالاب کے کنارہ چیتے کے گرد کھڑے ہوئے چیخ اور چلا رہے تھے اور چمگادڑ اس عظیم الشان جنگ کی خبر تمام جنگل میں جا کر مشتہر کر رہا تھا یہاں تک کہ جنگلی ہاتھی

بھی اس کو سُنکر چنگھاڑتا تھا۔ بندروں کے جو غول جنگل میں جا بجا منتشر تھے وہ یہ خبر پاتے ہی اپنے ساتھیوں کی امداد کے لئے ٹھنڈے بھٹ کو دوڑے آئے۔ غرضکہ اس قیامت کا شور ہوا کہ ون کے پرندے بھی میلوں تک جاگ اُٹھے۔

اِس وقت اژدہا لپکتا ہوا سیدھا بندروں کی طرف آیا۔ اژدہا جب لڑتا ہے تو اپنے حریف کو اپنے تمام جسم کا تُلا ہوا زور لگا کر سر کی ٹکر مارتا ہے۔ اگر تم اس بات کو اپنے تصوّر میں لا سکو کہ ایک برچھا یا ہتوڑا جس کا وزن قریب چودہ من کے ہو اور اُس کا دستہ ذی روح ہو اور پھر وہ دستہ اپنی قوت ارادی کو تحریک میں لاکر اپنے پھل کی ضرب بزور تمام کسی شے پر لگائے تو تم سرسری سا تخمینہ اژدہے کے لڑنے کی قوت کا کر سکو گے۔ چار یا پانچ فٹ لمبا اژدہا اگر آدمی کی چھاتی پر ٹکر مارے تو اُسے گرا سکتا ہے۔ لیکن ناظرین کو معلوم ہے کہ جس اژدہے کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ تیس فٹ لمبا تھا۔ اُس نے آکر پہلی ٹکر بندروں کے اُس گروہ پر ماری جو ریچھ کو گھیرے ہوئے تھا۔ دوسری ٹکر کی ضرورت نہ تھی۔ بندر یہ کہتے ہوئے تتر بتر ہو گئے "اژدہا آیا! اژدہا آیا! دوڑو! بھاگو!"

بندر نسلاً بعد نسلٍ اپنے بڑوں سے اژدہے کے جو قصے سُنتے چلے آئے تھے اُنکی وجہ سے اُن کے دلوں میں اژدہے کی طرف سے ایسا خوف بیٹھ گیا تھا کہ بیان نہیں ہو سکتا اُن کے سُننے میں آیا تھا کہ اژدہا رات کے وقت چپکے سے شاخوں پر چڑھ کر مضبوط سے مضبوط بندر کو چرا لے جاتا ہے اور اپنی شکل ایک بوسیدہ شاخ سے کچھ ایسی ملا دیتا ہے کہ دانا سے دانا بندر کو دھوکا ہو جاتا ہے۔ جنگل میں بندر اگر کسی سے ڈرتے تھے تو اژدہے سے کیونکہ اُن میں سے کوئی اُس کی طاقت کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ اُس سے آنکھ ملا سکے اور کوئی بندر جس کے گرد اژدہا ایک دفعہ لپٹ گیا زندہ نہیں بچا۔ غرضکہ مارے خوف کے لرزتے اور کانپتے ہوئے وہ بھاگ کر دیواروں اور مکانوں کی چھتوں پر جا چڑھے۔ اور بیچارے ریچھ نے اطمینان کی ایک سانس لی۔ اگرچہ اُس کی کھال چیتے کی کھال کے مقابلہ میں زیادہ

سخت اور موٹی تھی لیکن پھر بھی زخموں سے اُس کی پیٹھ چُور ہو رہی تھی۔ اُس وقت اژدہے نے پہلی مرتبہ اپنا مُنہ کھولا اور اس زور سے پھنکار ماری کہ دور دراز سے جو بندر بھنڈے بھٹ کو غنیم کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے رفیقوں کی مدد کو چلے آ رہے تھے خائف ہو کر جہاں تھے وہیں رہ گئے یہاں تک کہ درختوں کی لدی ہوئی شاخیں اُن کے بوجھ سے جُھک کر دُہری ہو گئیں اور ٹوٹنے لگیں۔ دیواروں اور خالی مکانوں کی چھتوں پر جو بندر تھے وہ دم بخود ہو کر رہ گئے اور خاموشی کے عالم میں جو اُس وقت طاری ہوا راجہ مینڈک نے چیتے کے تالاب سے نکلنے اور اپنے بھیگے ہوئے جسم کو جھٹکنے کی آواز سُنی۔ اُس وقت پھر شور و گیر بلند ہوا۔ بندر پھلانگیں مارتے ہوئے دیواروں اور فصیلوں اور بُرجوں کے بلند ترین مقامات پر چڑھ گئے اور چیخنے چلّانے لگے اور راجہ مینڈک نے جو شہ نشین میں اطمینان سے ناچ رہا تھا جالیدار جھروکوں میں سے بندروں کی حالت زار کو دیکھ کر اپنے سامنے کے دانتوں میں سے اُلّو کی طرح بول بول کر اپنی حقارت و نفرت کے اظہار کے طور پر شور مچانا شروع کیا۔

چیتا ہانپ کر بولا "آدمی کے بچے کو اس پھندے میں سے کسی طرح باہر نکالو۔ مجھ میں اب زیادہ لڑنے کی تاب نہیں۔ بہتر ہو گا کہ بچہ کو لے کر ہم یہاں سے چل دیں۔ ممکن ہے کہ وہ ہم پر پھر حملہ کریں"

اژدہے نے پھنکار مار کر کہا "جب تک میں حکم نہ دوں وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے"

اژدہے کے یہ بات کرتے ہی شہر پر پھر خاموشی چھا گئی اور ریچھ بولا۔

"بھائی اژدہے تم نے میری اور چیتے کی جان بچا لی"

اژدہے نے جواب دیا "اس وقت اس کا ذکر جانے دو۔ یہ بتاؤ کہ وہ آدمی کا بچہ کہاں ہے"؟

یہ سُنتے ہی راجہ مینڈک پکارا "میں یہاں اس پھندے میں پھنسا ہوں نکل نہیں سکتا"

اس پر پھن دار سانپ اندر سے پکارے "اسے یہاں سے لے جاؤ۔ یہ موگلی

طرح ناچ رہا ہے۔ ہمارے بچوں کو پاؤں میں مسل ڈالے گا"

اژدہے نے ہنسکر کہا:" واہ وا۔ یہ آدمی زاد تو خوب ہے۔ جدہر دیکھا سکے دوست ہی دوست ہیں۔ اسے آدمی زاد پرے ہٹ کر کھڑا ہو جا اور اے زہریلی قوم والو تم بھی چھپ جاؤ۔ میں اس دیوار کو توڑتا ہوں"

اژدہے نے بغور دیکھا تو سنگ مرمر کے جالیدار جھروکے میں اُسے ایک ٹوٹا ہوا مقام نظر آیا۔ اُس نے زمین کی سطح سے اپنے جسم کو دو گز بلند کر کے اس دراڑ پر چھ سات ٹکریں زور زور سے ماریں۔ جالیدار جھروکا ٹوٹ کر نیچے گر پڑا اور راجہ مینڈک کود کر باہر نکل آیا اور ریچھ اور چیتے کو لپٹ گیا۔ ریچھ نے بہ شفقت تمام اُسے چھاتی سے لگایا اور کہا۔

"تمہیں چوٹ تو نہیں آئی"؟

راجہ مینڈک نے جواب دیا:" بھوک اور تکان کے مارے میری بُری حالت ہو رہی ہے اور چوٹ بھی لگی ہے لیکن میرے بھائیو میں تمہاری یہ کیا حالت دیکھتا ہوں۔ تمہارا تمام بدن لہولہان ہو رہا ہے۔

اس پر چیتے نے اپنے ہونٹ چاٹ کر اور مرے ہوئے بندروں کی طرف جن کے ڈھیر چبوترہ اور تالاب کے کنارہ پر لگ رہے تھے۔ دیکھکر کہا:" ہمارا بدن تو لہولہان ہو رہا ہے مگر ہم نے بھی دوسروں کا خون کچھ کم نہیں بہایا"

ریچھ نے پیار سے کہا:" میرے ننھے پیارے مینڈک اگر تو صحیح سلامت ہے تو مجھے اپنی کچھ پروا نہیں"

چیتا بولا:" بھیا مینڈک یہ دیکھو یہاں اژدہا موجود ہے جس کی وجہ سے ہم لڑائی جیتے اور تمہاری جان بچی۔ ہمارا جو طریقہ ہے اُس کے مطابق اُس کا شکریہ ادا کرو"

راجہ مینڈک نے پلٹ کر دیکھا تو اژدہے کا سر اپنے سر سے ایک فٹ بلند اُس نے لہراتا پایا۔ لڑکے کو اچھی طرح دیکھ کر اژدہے نے کہا۔

"تو یہ ہے وہ آدمی کا بچہ جس کی خاطر ہم نے یہ سفر اور لڑائی اختیار کی۔ اس کی جلد کیسی ملایم ہے اور بندروں سے یہ کس قدر مشابہ ہے۔ اے آدمی زاد خبردار کہیں میں کینچلی بدلنے کے بعد جھٹ پٹے کے وقت تجھ کو بندر سمجھ کر ہڑپ نہ کر جاؤں۔"

راجہ مینڈک نے یہ جواب دیا "ہمارا اور تمہارا خون ہے ایک۔ آج کی رات تو نے میری جان بچائی۔ اس لئے اے اژدہے اگر کبھی تجھے بھوک لگی تو جو شکار میں مارونگا وہ تیرا ہوگا۔"

اژدہے کی آنکھیں اگرچہ چمک رہی تھیں لیکن راجہ مینڈک کا دل خوش کن جواب سنکر وہ بولا "بھیا میں تمہارا بڑا مشکور ہوں لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم شکار کیا مارو گے؟ یہ میں اس لئے پوچھتا ہوں کہ جب تم شکار کرنے کو نکلو تو میں تمہارے پیچھے پیچھے آؤں۔"

لڑکے نے کہا "میں خود تو شکار کچھ نہیں مارتا۔ کیونکہ میں اس قدر چھوٹا ہوں۔ لیکن میں اُن کی طرف بکریاں ہانک لاتا ہوں جو انہیں مار سکتے ہیں۔ جب تو بھوکا ہو تو میرے پاس آئیو اور دیکھ لیجیو کہ میں نے سچ کہا تھا یا جھوٹ۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنے ہاتھ اُٹھائے اور بولا "میں ان سے بہت کچھ کام لے سکتا ہوں۔ اگر تو کبھی پھندے میں پھنس جائے تو میں اُس قرض کو ادا کر دوں گا جو میرے ذمہ تیرے چیتے اور ریچھ کی طرف سے واجب الادا ہے اے میرے دوستو! تم سب کو شکار میں خوب کامیابی حاصل ہو۔"

راجہ مینڈک کی اس خوش بیانی پر ریچھ خوش ہو کر بولا "شاباش میرے شاگرد شاباش تو نے خوب تقریر کی اور خوش آیند طور پر اپنے محسن کا شکریہ ادا کیا۔" اژدہے نے اپنا سر آہستہ سے راجہ مینڈک کے کاندھے پر تھوڑی دیر کیلیے رکھ دیا اور کہا "تیرا دل مضبوط ہے اور تیری زبان شیریں ہے۔ اے آدمی زاد تو اب جلد اپنے دوستوں کے ساتھ جنگل کو سدھار۔ چاند ڈوب رہا ہے اور تجھے سونا بھی ہوگا۔ اس کے علاوہ تیرے لئے بہتر ہے کہ جو کچھ اب ہونے والا ہے اُسے تو نہ دیکھے۔"

چاند پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا اور کانپتے ہوئے بندروں کی قطاریں دیواروں

اور فصیلوں پر ہلتی ہوئی جھالروں کی طرح نظر آرہی تھیں۔ ریچھ پانی پینے کے لئے تالاب کے کنارے گیا اور چیتا اپنی بچی ہوئی کھال کے سنوارنے میں مصروف ہوا۔ اور ہر اژدہا لہراتا ہوا چبوترہ کے وسط میں آیا اور اپنے دونوں جبڑوں کو اُس نے اِس زور سے بجایا کہ تمام بندروں کی نگاہیں بے اختیار اُس پر جم گئیں۔

اُس وقت اژدہا پکارا" چاند غروب ہو رہا ہے۔ کیا اتنی روشنی ابھی باقی ہے کہ تم دیکھ سکو ؟"

ہوا جس طرح درختوں میں اپنی غمناک راگنیاں گاتی ہوئی گذرتی ہے اسی طرح دیواروں پر ایک دھیما سا نوحہ بلند ہوا اور بندروں نے کہا " اے اژدہے ہم دیکھ رہے ہیں "

اس پر اژدہا بولا" اچھا اب ناچ شروع ہوتا ہے وہ ناچ جسے میری بھوک کا ناچ کہتے ہیں۔ اے بندرو خاموش ہو کر دیکھتے رہو "

یہ کہہ کر اژدہے نے چکر کاٹنے شروع کئے اور اِدھر سے اُدھر جھومنے لگا۔ کبھی وہ لہراتا ہوا اس طرح کی شکل بناتا جیسے آٹھ کا انگریزی ہندسہ (8) ہوتا ہے اور کبھی اُس کے گھومنے سے مثلث اور مثلث سے بتدریج مربع اور مربع سے مخمس کی عجیب و غریب کی شکلیں پیدا ہوئیں۔ اُس کی گردش مسلسل اور متصل تھی اور اُس کے سر سے برابر ایک دھیمی سی گونجتی ہوئی آواز نکل رہی تھی گویا کہ وہ کوئی افسون پڑھ رہا تھا۔ چاند کی روشنی اب غائب ہوتی چلی اور اندھیرا بڑھتا چلا اور آخر کار اژدہے نے پیچ و خم کھانا اور جھومنا موقوف کر دیا لیکن ابھی تک اُس کے جسم کے کھپروں کی سرسراہٹ سُنائی دے رہی تھی۔

ریچھ اور چیتا پتھر کی مورت کی طرح بےحس و حرکت کھڑے تھے اور راجہ مینڈک اس عجیب غریب تماشے کو دیکھکر محو حیرت ہو رہا تھا۔

آخر کار اژدہا یہ کہتا ہوا سُنائی دیا۔ اے بندرو کیا تم میرے حکم کے بغیر اپنے ہاتھ پاؤں ہلا سکتے ہو۔ بولو!"

بندروں نے جواب دیا ”اے اژدہے بغیر تیرے حکم کے ہم نہ پاؤں ہلا سکتے ہیں نہ ہاتھ“
اس پر اژدہے نے کہا ”اچھا سب کے سب ایک قدم میری طرف بڑھو“
یہ سنتے ہی بندروں کی قطاریں بے اختیار اژدہے کی طرف بڑھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ اور ریچھ اور چیتے نے بھی بیخودی کے عالم میں ایک قدم بندروں کے ساتھ آگے بڑھایا۔
اژدہا پھنکار مار کر بولا ”اور نزدیک آؤ“ اس حکم کے سنتے ہی سب کے سب پھر آگے بڑھے۔
راجہ مینڈک نے ریچھ اور چیتے کی گردن پر ہاتھ رکھکر انہیں ہٹانے کی کوشش کی اور یہ دونوں عظیم الجثہ جانور اسطرح چونک اُٹھے گویا کہ کسی نے انہیں یکایک سوتے سے جگادیا۔
چیتے نے دبی آواز میں راجہ مینڈک سے کہا ”اپنا ہاتھ میرے کندھے پر سے نہ اُٹھانا ورنہ میں پلٹ کر کھنچا ہوا اژدہے کی طرف چلا جاؤنگا“
راجہ مینڈک بولا ”کچھ بھی نہیں۔ بڈھا اژدہا صرف خاک پر گول لکیریں کھینچ رہا ہے چلو چل دیں“ غرضکہ تینوں نے دبے پاؤں۔
نکل شہر سے راہ جنگل کی لی۔
جنگل کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے لگنے سے جب ریچھ ذرا تازہ دم ہوا تو اُس نے کہا ”اب میری توبہ ہے جو میں اژدہے کی رفاقت کا کبھی طلبگار ہوں میرا تو دور ہی سے سلام ہے“
چیتا کانپ کر بولا ”اُس کا علم ہم سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ اگر میں ذرا اور ٹھہرتا تو کھنچا ہوا سیدھا اژدہے کے حلق میں چلا جاتا“
ریچھ نے کہا ”چاند کے دوبارہ نکلنے سے پہلے اس سڑک کو بہت سے مسافر طے کر چکے ہونگے۔ اپنے طریقہ کے مطابق اژدہے کو خوب شکار میسر ہوگا“
راجہ مینڈک جسکو اژدہے کی افسوں گری کا حال کچھ معلوم نہ تھا بولا ”مگر جو کچھ ہم نے دیکھا آخر کار اُس کا مطلب کیا تھا؟ میرے دیکھنے میں تو صرف اتنا آیا کہ ایک بڑا سانپ لہرا رہا ہے

اور مہمل دائرے لوحِ خاک پر کھینچ رہا ہے۔ اُس کی ناک بھی تمام زخمی ہو رہی تھی۔ "اہاہا! ادہو ہو ہوا"
چیتے نے غصہ کی آواز میں راجہ مینڈک کو ڈانٹا اور کہا "اے ناشکر گذار بچے جس طرح میرے کان اور پہلو اور پنجے اور ریچھ کی گردن اور کاندھے تیری خاطر زخمی ہوئے اسیطرح اژدہے نے بھی اپنی ناک کو تیری خاطر خون سے رنگا۔ اب کئی دن تک نہ تو ریچھ کو اور نہ مجھے شکار میں کوئی لطف آئے گا۔"

ریچھ بولا "زخموں کا ذکر چھوڑو۔ ہمیں آدمی کا بچہ تو پھر ملگیا۔"

چیتے نے جواب دیا "یہ سچ ہے لیکن جو وقت ہم نے مزے سے شکار میں گذارا ہوتا وہ اُس کی وجہ سے ہمیں اب مرہم پٹی میں گذارنا پڑیگا۔ میری تو آدھی پیٹھ بچ گئی ہے اور زخموں سے میں چُور ہو رہا ہوں۔ اس کے علاوہ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ میری آبرو خاک میں مل گئی۔ اے راجہ مینڈک یاد رکھ کہ مجھے جس کا نام کالا چیتا ہے اور جس کی گردن کبھی کسی کے سامنے خم نہیں ہوئی مجبور ہو کر اژدہے سے امان طلب کرنی پڑی اور اُس کی بھوک کے ناچ نے مجھے اور ریچھ دونوں کو الو کی طرح مبہوت بنا دیا۔ اے آدمی کے بچے یہ سب اس بات کا نتیجہ تھا کہ تو بندروں کے ساتھ کھیلا۔"

راجہ مینڈک نے غمزدہ ہو کر کہا "یہ سب سچ ہے۔ میں ایک شریر آدمی زاد ہوں مگر بھوک کے مارے میری حالت اس وقت بُری ہو رہی ہے۔"

چیتا غرّا کر بولا "اے ریچھ جنگل کا قانون اس بارہ میں کیا کہتا ہے۔؟"

ریچھ نہیں چاہتا تھا کہ راجہ مینڈک پر کوئی تازہ مصیبت لائے لیکن وہ جنگل کے قانون کو بھی توڑ نہیں سکتا تھا اس لئے اُس نے بجبر و اکراہ یہ جواب دیا "جو دوسروں کو تکلیف میں مبتلا کرے وہ ہمیشہ سزا کا مستوجب ہوتا ہے۔ لیکن اے چیتے اس بات کا تجھے لحاظ رکھنا چاہئے کہ وہ ابھی چھوٹا سا بچہ ہے۔"

اِس پر چیتے نے کہا "جو کچھ تم نے کہا مجھکو اس کا خود خیال ہے۔ لیکن چونکہ بچے نے

شرارت کی ہے اس لئے ضرور ہے کہ اُس کو سزا دی جائے ۔ راجہ مینڈک اگر تو اپنی صفائی میں کوئی ثبوت پیش کر سکتا ہے تو کرے"

راجہ مینڈک بولا" مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ مجھ سے فی الحقیقت غلطی ہوئی۔ ریچھ کو اور تجھ کو میری خاطر زخمی ہونا پڑا۔ میں مستوجب سزا ہوں"

اس پر چیتے نے راجہ مینڈک کو ہلکے سے پانچ چھ دہولیں لگائیں۔ کوئی چیتے کا بچہ ان دہولوں کو کھا کر نیند سے بھی بیدار نہ ہوتا لیکن آدمی کے بچے کے لئے یہ سخت سے سخت سزا تھی۔ مار کھا چکنے پر راجہ مینڈک بے کچھ کہے سُنے زمین پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

اب چیتے نے راجہ مینڈک کو مخاطب کر کے کہا۔ بھیّا میری پیٹھ پر سوار ہو جاؤ۔ ہم گھر چلتے ہیں"

جنگل کے قانون کی ایک خوبی یہ ہے کہ سزا سے تمام کدورتیں رفع ہو جاتی ہیں اور دل میں کوئی گرہ نہیں رہتی۔

راجہ مینڈک چیتے کی پیٹھ پر چڑھ بیٹھا اور تینوں بھیڑئیے کے غار کی طرف روانہ ہوئے رستہ میں ریچھ نے راجہ مینڈک کو بہت سی نصیحتیں کیں اور کہا" ایک دفعہ اتفاق سے میرا گذر انسانوں میں ہوا اور میں نے ایک انسان کی زبان سے کچھ منظوم نصیحتیں سُنیں۔ بہت سی باتیں تو میری سمجھ میں نہیں آئیں کیونکہ وہ کچھ انسانوں کے سمجھنے ہی کی باتیں تھیں لیکن اکثر باتیں ایسی تھیں جو مجھے بے اختیار پسند آئیں۔ وہ نظم مجھے اب تک یاد ہے۔ اور چونکہ میرا خیال ہے کہ تمہیں آخر کار انسانوں ہی میں جا کر رہنا ہے اور اُنہیں سے تمہیں سابقہ پڑے گا اس لئے میں وہ نظم تم کو سُناتا ہوں۔ تم اُسے یاد کر لو۔ وہ نظم یہ ہے"

سرودِ حیات

غلط ہے حضرتِ ناصح کا فرماں
کہ ہے یہ زندگی خوابِ پریشاں

نہیں شاید اُنہیں یہ نکتہ معلوم
کہ سویا اور مرا ہوتا ہے یکساں

سُراب آسا ہے اشیا کی حقیقت
عیاں کچھ اور ہے کچھ اور پنہاں

متاعِ واقفیت سے بھرا ہے
ہماری زندگی کا جیب و داماں

رکھے کیونکر لحد پر ناقۂ زیست
ملے جب روح سا اُس کو حُدی خواں

کہاں تھی روح اُس فتوٰی میں شامل
"ملے گا خاک میں ہر خاک انساں"

نہ غایت ہے ہماری عیش و راحت
نہ مقصد ہے ہمارا رنج و حرماں

جو مقصد ہے تو یہ ہے آج سے کل
گراں تر ہو ہمارا کفِّ میزاں

سمندِ وقت سرپٹ جا رہا ہے
ہے بے پایاں ترقی کا بیاباں

بپا ہے گرچہ دل میں اور جگر میں
اولوالعزمی کا اور ہمت کا طوفاں

مگر مجبور مرقد کی طرف ہم
چلے جاتے ہیں افتاں اور خیزاں

جہاں کے عرصۂ پیکار میں تم
رہو بنکر ہمیشہ مردِ میداں

رہے گر چیونٹی بن کر تو کیا لطف
ہے لطف اسمیں کم از کم ہو سلیماں

نہ مستقبل سے ہرگز میوہ چیں ہو
ہو سرسبز اسکا گو کیسا ہی بُستاں

غمِ ماضی کے سر پہ خاک ڈالو
تم اُس کی یاد سے مت ہو پریشاں

یہ نظم امریکہ کے مشہور شاعر لانگ فیلو کی ایک مقبولِ عام انگریزی نظم کا ترجمہ ہے جو میں نے کیا ہے۔ اس مقام پر میں نے اس نظم کو اس خیال سے درج کر دیا کہ

"خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں"

ظفر علیخاں

ہمیشہ حال سے رکھو سروکار — ہو پہلو میں دل اور سر پر ہو یزداں
سوانح عمریاں اُن کی جنھوں نے — کئے ہیں کام دنیا میں نمایاں
بتاتی ہیں کہ ہو سکتے ہیں ہم بھی — نمونۂ آسمانِ عظمت وشاں
سکھاتی ہیں سبق ہم کو یہ نادر — کہ چوں کشتی عمر آید بہ پایاں
نشانِ نقشِ پائے خود گذارید — بہ ریگِ ساحلِ دریائے دوراں
کہ از دیدنش ہر کشتی شکستہ — کہ باشد ہائم و نومید و حیراں
سُراغِ منزلِ مقصود یابد — پئے در دش شود ایں نقش درماں
بس اب اُٹھ بیٹھو اور کوشش میں لگ جاؤ — نہ ہو نیرنگئ قسمت سے ترساں

ہمیشہ صبر اور محنت سے لو کام
کہ اُن سے مشکلیں ہوتی ہیں آساں

ریچھ نے اس دل آویز نصیحت کو ختم کیا ہی تھا کہ بھیڑئے کا غار آپہنچا اور راجہ مینڈک اپنے گھر میں ایسا بے خبر پڑ کر سویا کہ جب اُس کی آنکھ کھُلی تو آفتاب نصف النہار پر بصد آب وتاب چمک رہا تھا۔

لنگوروں کا گیت

جو دیکھے ہماری قلابازیاں
اُچھلتے اُچکتے پُھدکتے ہوئے
تمہیں بندروں پر نہ کیونکر ہو رشک
تمہارے ہمارے سے ہوں ہاتھ پیر
کس انداز سے جھولتے ہیں پڑے
تصور ہے ایسا کہ اوروں پہ جو
عمل کی کفالت کرے علم پر
درندوں چرندوں پرندوں کا عمل
اوا ہمنے اک ساتھ اُنہیں کر دیا
اہا ہا اہا ہا اہو ہو اہو
نہیں ہم سے ملتے ہو پھر کس لئے
ہیں انگور کے خوشے لٹکے ہوئے
قسم ہم کو اُس غُل کی اور شور کی
ہم اب کام ایسا کریں کے کوئی

ہلالِ فلک شرم سے ہو نہاں
خلا میں لگاتے ہیں ہم سیڑھیاں
یہ ہوگی تمنّا تمہیں بے گماں
تمہاری ہماری سی دُم ہو کماں
پکڑ کر درختوں کی ہم ٹہنیاں
نہاں ہے وہ اپنے لئے ہے عیاں
ہوں ہم طرفۃ العین میں کامراں
سُنی ہمنے اب تک ہیں جو بولیاں
ہے جادو کا ٹکڑا ہماری زباں
ہے انسان کا سا ہمارا بیاں
تم اُن دیوداروں پہ چڑھ کر جہاں
جنہیں تاکتا ہے پڑا کہکشاں
ہے جنگل میں جو بندروں کا نشاں
کہ رہ جائیگا جس سے حیراں جہاں



راجہ مینڈک کی شیر افگنی

یہ میں نے پوچھا میاں شکاری شکار کیا تم نے جا کے مارا
کہا یہ اُس نے کہ بھائی گردش میں آجکل ہے میرا ستارا

یہ میں نے پوچھا کہاں وہ سانبھر ہے جسکو تم مارنے گئے تھے
کہا یہ اُسنے کہ کھا رہا ہے مزے سے ابتک وہ بن میں چارا

یہ میں نے پوچھا کیا ہوا اب وہ زور جس پر تھا ناز تم کو
کہا یہ اُس نے کہ میرے پہلو سے وہ ہمیشہ کو اب سدھارا

یہ میں نے پوچھا کہ تیز تیر ایسے تم کدھر جا رہے ہو آخر
کہا یہ اُسنے کہ بھٹ کو جاتے ہیں وقت آخر ہوا ہمارا

جب مجلس شوریٰ کے ٹیکرے پر بھیڑیوں کے غول سے لڑائی کرنے کے بعد راجہ مینڈک اپنے گرگ منش والدین کے مکان سے جو غار میں واقع تھا رخصت ہوا تو اُس نے سیدھا اُن کھیتوں کا رُخ کیا جہاں گاؤں والے رہتے تھے۔ لیکن چونکہ وہ اِس بات کو خوب جانتا تھا کہ مجلس والوں میں سے ایک اُس کا جانی دشمن ہو گیا ہے۔ اِس لئے اُس نے اُن کھیتوں میں جہاں سے جنگل پھر بھی نہایت قریب تھا ٹھہرنا پسند نہ کیا۔ قدم بڑھائے ہوئے اُس پگڈنڈی پر جو

وادی کے بیچوں بیچ جاتی تھی برابر بیس میل تک چلا گیا یہاں تک کہ وہ ایک ایسے خطہ میں پہنچا جسے اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا وادی کے اختتام پر ایک بہت بڑا میدان اُسے نظر آیا جس پر جابجا پہاڑیاں سر اُٹھائے کھڑی تھیں اور نالے بہ رہے تھے۔ ایک طرف ایک چھوٹا سا گاؤں آباد تھا اور دوسری طرف گھنا جنگل چراگاہوں اور علف زاروں کی سرحد تک پہنچکر دفعۃً اس طرح ختم ہو گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اُسے تیشہ سے کاٹ کر یہ حد فاصل قائم کر دی ہے۔ تمام میدان پر گابھن بھینسیں چر رہی تھیں اور جب لڑکوں نے جو ان گلوں کو چرا رہے تھے راجہ مینڈک کو دیکھا تو وہ چلاتے ہوئے بھاگ گئے۔ اور زرد رنگت کے لینڈی کتوں نے جو ہندوستان کے ہر گاؤں کے آس پاس دیکھنے میں آتے ہیں اُس کو دیکھکر بھونکنا شروع کیا۔ راجہ مینڈک سیدھا گاؤں کی طرف بڑھا چلا گیا کیونکہ اُسے بھوک لگ رہی تھی اور جب وہ گاؤں کے پھاٹک پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ کانٹے دار جھاڑیوں کی وہ ٹٹی جس سے شام کے وقت پھاٹک بند کیا جاتا تھا ایک طرف کو سرکی ہوئی ہے۔

اس قسم کی باڑیں راجہ مینڈک اپنی شبانہ گشتوں میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا چنانچہ اس ٹٹی کو دیکھ کر وہ بولا:۔ "معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے انسان بھی جنگل والوں سے ڈرتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ پھاٹک کے پاس بیٹھ گیا اور جب ایک آدمی کا ادھر سے گذر ہوا تو اُس نے کھڑے ہو کر اپنا مُنہ کھولا اور اُنگلی اُس کے اندر لیگیا گویا کہ وہ یہ کہتا تھا کہ مجھے کچھ کھانے کو دو۔ اس آدمی نے خوف اور حیرت بھری نگاہوں سے لڑکے کو دیکھا اور پھر چلاتا ہوا اُلٹے پاؤں گاؤں کے مہنت کو بلانے کے لئے بھاگا۔ مہنت ایک طویل القامت اور فربہ اندام شخص تھا جو سفید کپڑے پہنے تھا۔ اور جس کے ماتھے پر لال اور پیلے رنگ کا ٹیکا لگا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ پھاٹک پر پہنچا۔ اُس کے پیچھے پیچھے گاؤں کے سو سوا سو آدمی ہوں گے جو راجہ مینڈک کو گھور گھور کر دیکھتے تھے اور شور مچا کر اُنگلیاں اٹھا کر اُس کی طرف اشارہ کرتے تھے۔

راجہ مینڈک نے اپنے دل میں کہا "یہ آدمی بھی کیسے بے تمیز ہیں۔ جو حرکتیں یہ

اس وقت کر رہے ہیں وہ صرف خاکی رنگ والے لنگور کرتے ہیں" چنانچہ اُس نے اپنے لمبے بال اپنے چہرہ پر سے پیچھے ہٹا کر تیوری چڑھائی اور غصہ آلود نگاہ سے آدمیوں کے مجمع کو دیکھا
مہنت نے لوگوں سے کہا "یہ تو کس بات کا ہے۔ اس لڑکے کے بازوؤں اور ٹانگوں پر جو نشان ہیں اُن کو غور سے دیکھو۔ یہ بھیڑیوں کے کاٹنے کے نشان ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچہ بھیڑیوں میں پلا ہے اور بڑا ہو کر جنگل سے بھاگ آیا ہے"
مہنت نے جو بات کہی وہ سچ تھی۔ راجہ مینڈک جب بھیڑئے کے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا تو وہ بعض دفعہ اُسے ذرا زیادہ زور سے منہ مار بیٹھتے تھے اور اس لئے اُس کے تمام جسم پر دانتوں کے نشان پڑے ہوئے تھے۔ لیکن خود راجہ مینڈک سے اگر سوال کیا جاتا تو وہ کبھی نہ کہتا کہ یہ کاٹنے کے نشان ہیں کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ اصلی کاٹنا کس کو کہتے ہیں۔
دو تین عورتیں مل کر پکار اُٹھیں "ارے رے رے! اس بیچارے بچہ کو بھیڑیوں نے کاٹا ہے۔ کیسے افسوس کی بات ہے۔ اور اس لڑکے نے شکل کیا پیاری پائی ہے۔ اس کی آنکھیں سُرخ انگار کی طرح ہیں۔ ارے میسوا مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی تیرا لڑکا ہے جسے شیر اُٹھا کر لیگیا تھا"
یہ سُن کر ایک عورت نے جس کے ہاتھوں میں تانبے کے کڑے اور پاؤں میں تانبے کی جھانجھیں پڑی تھیں راجہ مینڈک کو بغور دیکھا اور بولی "مجھے تو نہیں معلوم ہوتا۔ میرا بچہ ایسا دُبلا پتلا نہ تھا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اُس کی عام شکل شباہت میرے لڑکے سے ملتی جلتی ہے"
مہنت ایک بڑا ہوشیار اور چلتا ہوا آدمی تھا۔ اُسے خوب معلوم تھا کہ میسوا گاؤں کے سب سے زیادہ مالدار شخص کی بی بی ہے چنانچہ اُس نے آنکھ اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور کچھ دیر کے بعد ایک ایسے لہجہ میں جس سے غیب دانی کی بو آتی تھی پکارا "جنگل نے جو کچھ لیا تھا اُسکو بجنسہ واپس کر دیا۔ اے بہن اس لڑکے کو جو تیرے ہی کلیجے کا ٹکڑا ہے اپنے گھر لیجا اور اُس مہنت کی سیوا کر جس نے اُن بوجھی باتوں کو دریافت کر کے تیرے بیٹے کو تجھ سے پھر

ملا دیا ہے"

اس وقت راجہ مینڈک نے دل ہی دل میں کہا "قسم ہے اُس بیل کی جس نے میری جان خریدی تھی کہ اس تمام گفتگو سے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا بھیڑیوں کا غول دوسری دفعہ مجھے شناخت کر رہا ہے۔ خیر اگر میں آدمی ہوں تو مجھے لامحالہ آدمی ہی بننا پڑے گا"

عورت راجہ مینڈک کو اشارہ سے اپنے جھونپڑے میں لیگئی جہاں ایک طرف ایک طرف ایک کھاٹ بچھی ہوئی تھی۔ اور ایک طرف اناج کی ایک بہت بڑی مٹی کی کوٹھیا جس پر عجیب وغریب مورتیں بنی ہوئی تھیں رکھی تھی۔ پانچ چھ تانبے کی پتیلیاں اور کچھ برتن چنے ہوئے تھے۔ ایک طاقچہ میں کسی دیوتا کی مورت رکھی ہوئی تھی اور دیوار پر ایک آئینہ جو دیہات کے میلوں میں ڈیڑھ دو آنہ کو ملتا ہے لٹکا ہوا تھا۔ راجہ مینڈک کو اُس نے بہت سا دودھ اور کچھ روٹی پیٹ بھر کے کھانے کو دی اور جب وہ کھا چکا تو اُس نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اُس کی آنکھوں کو بغور دیکھا۔ کیونکہ اُسے یہ خیال تھا کہ ممکن ہے کہ یہ میرا ہی بیٹا ہو اور جنگل سے جہاں شیر اُسے لیگیا تھا بڑا ہو کر چلا آیا ہو۔ یہ سوچکر اُس نے راجہ مینڈک کو ناتھو کے نام سے اپنی طرف مخاطب کرنا چاہا لیکن لڑکے نے اس نام کو نہیں پہچانا۔ پھر وہ بولی "کیا تجھے وہ دن یاد ہے جب میں نے تجھے نیا جوتا پہننے کو دیا تھا" یہ کہہ کر اُس نے لڑکے کے پاؤں کو ہاتھ سے چھو کر دیکھا مگر اُنکو کھروں کی طرح سخت پاکر غمگین آواز میں وہ بولی "یہ پاؤں ایسے نہیں جنہوں نے کبھی جوتا پہنا ہو۔ مگر تیری شکل میرے لڑکے ناتھو سے بہت ملتی ہے اور اس لئے میں تجھکو اپنا بیٹا سمجھوں گی"

راجہ مینڈک بے چینی کی حالت میں تھا کیونکہ اس سے پہلے اُس نے اپنے آپ کو چھت کے نیچے نہیں پایا تھا لیکن جب اُس نے دیکھا کہ چھت پھونس کی ہے اور کھڑکی میں بھی کوئی کھڑکی نہیں لگی ہے تو اُسے اطمینان ہوا کیونکہ اُس نے سمجھ لیا کہ جب چاہونگا چھت پھاڑ کر یا کھڑکی میں سے پھاند کر باہر نکل جاؤنگا۔ آخرکار اُس نے آپ ہی آپ یہ باتیں کرنی شروع کیں "جب میں انسانوں کی بولی نہیں سمجھ سکتا تو میرے انسان ہونے سے کیا فائدہ جنگل

میں اگر کوئی آدمی ہمارے ساتھ رہے تو جیسا گونگا اور مبہوت بنکر وہ رہتا ویسا ہی میں بھی یہاں ہوں۔ اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ میں بھی آدمیوں کی بولی بولنی سیکھوں۔"

جنگل میں بھیڑیوں کے ساتھ رہ کر ہرن اور جنگلی سور کی آواز کی نقل اُتارنے میں اُس نے جو مشق بہم پہنچائی تھی وہ اُس وقت اُس کے کام آئی۔ میسوا کی زبان سے جو لفظ نکلتا اُسے راجہ مینڈک اپنی زبان سے بعینہٖ ادا کر دیتا اور سورج چھپنے سے پہلے اُس نے بہت سی چیزوں کا نام جو جھونپڑے میں تھیں سیکھ لیا۔

جب سونے کا وقت آیا تو مشکل پیش آئی کیونکہ میسوا اور اُس کے خاوند نے راجہ مینڈک کو سلانے کی ہزار کوشش کی مگر وہ جھونپڑے میں جسکو وہ ایک طرح کا پھندا سمجھتا تھا سونے پر راضی نہوا۔ اور جب اُنہوں نے دروازہ بند کر دیا تو وہ کھڑکی میں سے باہر نکل گیا۔ یہ دیکھ کر میسوا کا خاوند بولا "اُسے اپنی مرضی پر چھوڑ دے۔ آجتک اُسے بستر پر سونا کہاں نصیب ہوا ہوگا۔ اگر دیوتاؤں نے اُسے ہمارے گم گشتہ بیٹے کی جگہہ بھیجا ہے تو وہ بھاگے گا نہیں۔"

غرضکہ راجہ مینڈک کچھ صاف پاک لمبی لمبی گھاس میں جو کھیت کے کنارے اُگی ہوئی تھی سونے کے لئے لیٹ گیا لیکن ابھی اُس کی آنکھ نہ لگی تھی کہ ایک خاکی رنگ کی ملایم تھوتھنی اُس کی ٹھوڑی سے آلگی۔

یہ خاکی بھائی تھا جو بھیڑئے کی مادہ کا پہلوٹا بچہ تھا۔ اُس نے راجہ مینڈک سے یوں خطاب کیا "بیس میل تیرے پیچھے پیچھے آنے کا یہ مجھے اچھا صلہ ملا۔ تیرے پاس سے ابھی سے انسان کی طرح دہوئیں اور مویشیوں کی بو آرہی ہے۔ بھیا جاگ میں تیرے لئے پیغام لایا ہوں۔"

راجہ مینڈک نے اُس سے بغلگیر ہو کر کہا "کہو جنگل والے سب خیریت سے ہیں"؟

خاکی بھائی نے جواب دیا "جو بھیڑئے سُرخ پھول سے جل گئے تھے اُن کے سوا اور سب اچھے ہیں۔ شیر خاں کی کھال بھی بہت جل گئی تھی اور اس لئے تندرست ہوتے تک وہ دوسری شکارگاہوں میں دن گذارنے کے لئے چلا گیا ہے لیکن اُس نے یہ قسم کھائی ہے کہ جب

میں جنگل کے اس حصہ میں واپس آؤں گا تو راجہ مینڈک کی ہڈیاں دین گنگا میں بہاؤں گا۔"

راجہ مینڈک :- اس کا جواب یہ ہے کہ میں بھی دل میں ٹھان چکا ہوں کہ اب کی مرتبہ جو میں مجلس شوریٰ کے ٹیکرے پر گیا تو شیر خاں کی کھال ہی سر پر اوڑھ کر جاؤں گا۔ خیر تو نے یہ خبر مجھے اچھی سنائی۔ آج کی رات تو میں نہایت تھکا ہوا ہوں مجھے سونے دے۔ لیکن بھائی جو نیا واقعہ جنگل میں پیش آیا کرے اس کی مجھے اطلاع کرتا رہا کر۔

خاکی بھائی :- "تم اس بات کو تو نہیں بھول جاؤ گے کہ تم بھیڑئے ہو؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ انسانوں میں رہ کر تم ہمیں بھول جاؤ۔؟"

راجہ مینڈک :- میں کبھی نہیں بھولونگا۔ مجھے یہ بات بھی ہمیشہ یاد رہیگی کہ مجھے تجھ سے اور تمام غار والوں سے محبت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بات بھی ہمیشہ یاد رہیگی کہ غول نے مجھے اپنی جماعت سے نکال دیا۔"

خاکی بھائی :- "کہیں تم آدمیوں کے غول سے بھی نہ نکال دئے جاؤ۔ بھیا آدمی آخر آدمی ہیں۔ اور اُن کی وہی حالت ہے جو تالاب میں مینڈک کی ہوتی ہے جب میں یہاں پھر آؤں گا تو اُن بانسوں کے جھنڈ میں جو چراگاہ کے کنارے کھڑا ہے تمہارا انتظار کروں گا۔"

اس رات کے بعد تین مہینے تک راجہ مینڈک آدمیوں کے اوضاع واطوار اور رسوم وعادات کے سیکھنے میں ایسا مصروف رہا کہ گاؤں کے پھاٹک سے ایک دفعہ بھی باہر نکلنے کا اُسے بمشکل موقعہ ملا۔ اوّل اوّل اُس نے لنگوٹی باندھنی سیکھی جس سے اُسے نہایت سخت تکلیف ہوئی۔ پھر اُسے روپیہ پیسہ کا استعمال سکھایا گیا جو خاک اُس کی سمجھ میں نہ آیا اور اُس کے بعد اُسے ہل سے زمین جوتنے کا سبق دیا گیا لیکن اُسے یہ نہ معلوم ہوا کہ اس سے کیا فائدہ ہے۔ گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچے اُسے ستاتے اور دق کرتے تھے لیکن خوش قسمتی سے جنگل کے قانون نے اُسے غصہ ضبط کرنا سکھا دیا تھا کیونکہ جنگل میں زندگی کا قائم رکھنا اور خوراک کا حاصل کرنا اس بات پر منحصر ہے کہ تم غصہ کو ضبط کر سکو۔ جب وہ اُن کے ساتھ کھیلنے یا پتنگ اُڑانے میں شریک نہ ہوتا یا کسی لفظ کو غلط بولتا اور

لڑکے اُس سے ٹھٹھا کرتے تو صرف یہ خیال کہ ننھے بیکس بچوں کا مارنا بزدلی کی دلیل ہے اُسے اِس بات سے باز رکھتا تھا کہ وہ اُنہیں دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر چیر ڈالے۔ اُسے اپنی جسمانی طاقت کی کیفیت ذرا معلوم نہ تھی جس زمانہ میں وہ جنگل میں رہتا تھا تو وہ جانتا تھا کہ میں درندوں کے مقابلہ میں کم زور ہوں۔ لیکن گاؤں میں لوگ اُس کی طاقت پر حیرت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اُس میں سانڈ جتنا زور ہے۔ اور ڈر کو تو وہ جانتا ہی نہ تھا کہ کیا چیز ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ گاؤں کے مہنت نے اُس سے کہا کہ اگر تو میرے آم کھائیگا تو دیوتا تجھ سے ناراض ہو جائے گا۔ راجہ مینڈک یہ سُن کر دیوتا کی مورت اُٹھا لایا اور مہنت کے سامنے اُسے رکھ کر کہنے لگا کہ اس سے کہہ کہ ناراض ہو اگر میں نے اس کو ٹھنی نہ دی تو جب ہی کہیو۔ راجہ مینڈک کی یہ حرکت نہایت ہی ملحدانہ تھی اور گاؤں میں اس کی وجہ سے ایک کھلبلی سی پڑ گئی لیکن مہنت نے معاملہ کو رفع دفع کر دیا اور دیوتا کا غصہ فرو کرنے کے لئے میسوا کے خاوند کو بہت سی نقدی کا چڑھاوا مندر میں لے جا کر چڑھانا پڑا۔ راجہ مینڈک کو ذات یا برن کا ذرا بھی خیال نہ تھا۔ ایک دفعہ گاؤں کے کسی کمہار کا گدھا گڑھے میں گر پڑا۔ راجہ مینڈک نے اُسے دُم سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا اور کنہی واڑہ کے بازار تک کمہار کو برتنوں کے لیجانے میں مدد دی۔ یہ واقعہ بھی بدنامی کے لحاظ سے پہلے سے پہلے سے کچھ کم نہ تھا کیونکہ کمہار نیچ قوم کا آدمی ہوتا ہے اور اُس کا گدھا اُس سے بھی زیادہ ذلیل اور رذیل ہے۔ جب مہنت نے راجہ مینڈک کو اُس کی اس حرکت پر ملامت کی تو اُسنے مہنت کو دھمکی دیکر کہا کہ اگر تو زیادہ ٹرایا تو تجھے بھی گدھے پر سوار کرا دوں گا۔ غرضکہ مہنت نے میسوا کے خاوند سے کہا کہ لڑکا اب بہت آوارہ ہو چلا ہے۔ بہتر ہے کہ اسکو کسی کام پر لگایا جائے۔ اُسی شام کو گاؤں کے نمبردار نے راجہ مینڈک سے کہا کہ کل سے تو جنگل میں بھینسیں لیجا کر چرایا کر۔ راجہ مینڈک یہ سُن کر بڑا خوش ہوا اور اس حیثیت سے کہ گاؤں کی ایک خدمت اُس کے سپرد ہوئی تھی وہ اُسی رات ایک جماعت میں جو روز رات کے وقت ایک پکے چبوترے پر ایک بڑے انجیر کے درخت کے نیچے جمع ہوا کرتی تھی جا شریک ہوا۔ یہ جگہ گاؤں کی چوپال تھی اور نمبردار اور چوکیدار

اور نائی اور بلدیو شکاری جس کے پاس ایک مُنہ سے بھرنے کی بندوق تھی یہاں مل کر گپ شپ اُڑایا اور حقہ پیا کرتے تھے۔ درخت کی شاخوں پر بندروں کا بسیرا تھا اور چبوترے کے نیچے ایک بانبی میں ایک ناگ رہتا تھا جس پر شام ہوتے ہی گاؤں کے لوگ مقدس سمجھ کر دودھ کا چڑھاوا چڑھایا کرتے تھے۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے اس درخت کے گرد اگرد بیٹھ کر بہت رات گئے تک حقہ کے دم لگایا اور باتیں کیا کرتے تھے۔ دیوتاؤں اور آدمیوں اور بھوتوں پریتوں کے عجیب و غریب قصے یہ لوگ آپس میں بیان کرتے اور بلدیو اُن کو اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز قصے جنگل کے درندوں کے اوضاع و اطوار اور طریقۂ بود و باش کے سُناتا۔

راجہ مینڈک کو جسے قدرتی طور پر اس مضمون سے دلچسپی تھی اور جو گویا جنگل والوں کے گھر کا بھیدی تھا بلدیو کی لن ترانیاں سُن کر بے اختیار ہنسی آتی اور جب وہ مسلسل بے سر و پا روایتیں اپنے حیرت زدہ سامعین کو اپنی ایک ضربی بندوق گھٹنے پر رکھ کر سُناتا تو راجہ مینڈک مُنہ چھپا کر اتنا ہنستا کہ اُس کے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے۔

بلدیو یہ بیان کر رہا تھا کہ میسوا کے بیٹے کو جو شیر لیگیا تھا اُس کے بدن میں ایک بڈّھے خبیث مہاجن کی روح جو چند سال قبل مر گیا تھا حلول کر گئی ہے اور اب وہ شیر بھوت بنکر جنگل میں پھرتا ہے۔ بلدیو کہنے لگا کہ "مجھے خوب معلوم ہے کہ یہ بات سچ ہے کیونکہ پورن داس مہاجن اُس چوٹ کی وجہ سے جو اُسے اُس دنگے میں لگی تھی جبکہ اُس کی تمام بہیاں جلادی گئی تھیں لنگڑا کر چلتا تھا اور جس شیر کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ بھی لنگڑا کر چلتا ہے کیونکہ اُسکے پنجوں کے نشان یکساں نہیں"۔

اس پر سب بڈّھے سر ہلا کر بولے "بلدیو کی بات سچ ہے۔ اس میں ذرا شک نہیں"۔

راجہ مینڈک سے اب نہ رہا گیا اور اُس نے مجمع کی طرف خطاب کر کے کہا "تم لوگ پاگل تو نہیں ہو گئے جو ایسی لغو اور مہمل باتوں کو سچ سمجھتے ہو۔ جس شیر کا بلدیو نے ذکر کیا ہے وہ اس لئے لنگڑاتا ہے کہ وہ پیدا ہی لنگڑا ہوا تھا۔ ایک مہاجن کی روح کو ایک ایسے درندہ کے جسم کے اندر بتانا جس میں گیدڑ جتنی ہمت بھی نہ ہو بچوں کی بکواس ہے"۔

راجہ مینڈک کی یہ بات سُنکر بلدیو سے مارے حیرت کے کچھ دیر تک بولا نہ گیا اور نمبردار مبہوت ہوکر لڑکے کا مُنہ دیکھنے لگا۔

آخر کار بلدیو پکارا "اخاہ! یہ وہی جنگل کا لونڈا ہے۔ اگر تو ایسا دانشمند ہے تو کیوں اِس شیر کو مار کر اُس کی کھال کنشی واڑہ نہیں لے جاتا کیونکہ اس شیر کے مارنے والے کے لئے سرکار نے ایک سو روپیہ کا انعام مقرر کیا ہے۔ دیکھ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ جو لوگ عمر میں تجھ سے بڑے ہوں جب وہ بات کرتے ہوں تو اُن کی باتوں میں دخل مت دیا کر۔

راجہ مینڈک اُٹھ کھڑا ہوا اور یہ کہہ کر چل دیا "جنگل کے جانوروں کے متعلق بلدیو نے جتنی باتیں کہی ہیں اُن میں سے ایک دو کے سوا سب جھوٹی ہیں۔ حالانکہ جنگل گویا اُس کے گھر کا دروازہ ہے۔ پھر بھلا میں کیسے یقین کروں کہ دیوتاؤں اور بُھوتوں پریتوں کے قصّے جنہیں وہ آپ بیتی بتاتا ہے سچ ہیں"

راجہ مینڈک کی یہ گستاخانہ تقریر سُن کر بلدیو بیحد جھلّایا اور نمبردار بولا کہ یہ لڑکا واقعی اب بہت شریر ہوگیا ہے۔ اب ضرور بھینسوں کا چرانا اس کے سپرد کرنا چاہئے۔

ہندوستان کے اکثر گاؤں کی یہ رسم ہے کہ کچھ لڑکے صبح ہوتے ہی گایوں بھینسوں کو چرانے کے لئے جنگل میں لیجاتے ہیں۔ اور رات کے وقت واپس لے آتے ہیں۔ کوئی انگریز اِن جانوروں کے پاس اگر آئے تو یہ اُس پر حملہ کرکے اُسے پاؤں میں روند ڈالیں۔ لیکن ان لڑکوں سے جو قد میں اُن کی ٹانگ برابر ہوں گے یہ جانور کچھ ایسے مانوس ہیں کہ لڑکے اُن کو ڈنڈے مارتے ہیں اور ستاتے ہیں لیکن یہ کان تک نہیں ہلاتے۔ لڑکے جب تک گلوں کے ساتھ رہیں اُسوقت تک اُنہیں کوئی خطرہ نہیں کیونکہ گایوں بھینسوں کی ایک جماعت پر شیر کو بھی حملہ کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ لیکن اگر وہ پھول چُننے یا گرگٹ مارنے میں مصروف ہوکر گلّہ سے علیحدہ ہوجائیں تو بعض دفعہ شیر یا کوئی اور درندہ اُنہیں اُٹھا کر لیجاتا ہے۔ راجہ مینڈک گلّہ کے بڑے سانڈ راما کی پیٹھ پر سوار ہوکر پو پھٹتے ہی گاؤں کی گلی میں سے گذرا اور بھینسیں باڑوں میں سے نکل نکل کر اُس کے پیچھے ہو لیں

راجہ مینڈک نے اپنے طرزِ عمل سے دوسرے لڑکوں پر جلد اس بات کو ثابت کر دیا کہ اُنہیں اُس کا حکم ماننا پڑے گا۔ اُس نے بھینسوں کو بانس کی ایک لمبی چھڑی سے ہانکنا شروع کیا اور ایک دوسرے لڑکے کامیا سے جو اُس کے ساتھ تھا کہا کہ تو گایوں کو لے جا کر چرا میں بھینسوں کو چراتا ہوں لیکن گلہ سے ایک پل بھر کے لئے بھی علیحدہ مت ہونا۔

ہندوستان کی چراگاہیں پہاڑیوں ٹیکروں نالوں اور جھاڑیوں کا ایک پریشان مجموعہ ہوتی ہیں جن میں ڈھوروں کے گلّے چرنے کے لئے پھیلکر نظر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ بھینسیں بالعموم جوہڑوں اور کیچڑ والی جگہ کو پسند کرتی ہیں جہاں وہ چھوٹے پانی یا کیچڑ میں گھنٹوں لوٹا کرتی ہیں۔ راجہ مینڈک اُنہیں اُس میدان کے کنارہ کی طرف ہانکتا ہوا لیگیا جس میں وین گنگا کی ندی جنگل سے نکل کر بہتی تھی۔ یہاں پہنچکر وہ راما کی پیٹھ پر سے اُتر پڑا اور بھاگا ہوا بانسوں کے ایک جھنڈ کی طرف گیا۔ یہاں اُس نے خاکی بھائی کو کھڑا پایا۔ خاکی بھائی نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔

"اخاہ! بھیا تم ہو۔ میں نے مدتوں یہاں تمہارا انتظار کیا ہے۔ آج خدا خدا کر کے تم آئے لیکن ان گایوں بھینسوں کے چرانے کے کیا معنی؟

راجہ مینڈک: "مجھے گاؤں والوں نے کچھ عرصہ کے لئے چرواہا مقرر کیا ہے۔ کہو شیر خاں کی کیا خبر ہے۔"

خاکی بھائی: "شیر خاں اس نواح میں واپس آگیا ہے اور کئی دن تک تمہاری تاک میں رہا ہے لیکن چونکہ شکار آج کل کمیاب ہے اس لئے وہ کچھ دنوں کے لئے پھر چلا گیا ہے۔ بہرحال وہ تمہاری جان کے درپے ہے۔

راجہ مینڈک: "کیا مضایقہ ہے۔ یہ تو میں پہلے ہی سے جانتا ہوں کہ وہ میرا دشمن ہے اب میں تم سے ایک بات کہتا ہوں کان لگا کر سنو۔ جب تک کہ شیر خاں اس جنگل میں واپس آئے اُس وقت تک تم یا تم چاروں بھائیوں میں سے کوئی ایک اُس سامنے کی چٹان پر بیٹھا کرے تاکہ جب میں گاؤں سے نکلوں تو تمہیں دیکھ لیا کروں۔ جب شیر خاں واپس آجائے تو تم اُس نالے میں جو اس میدان

کے بیچوں بیچ واقع ہے ڈھاک کے درخت کے نیچے میرا انتظار کرنا۔ احتیاط لازم ہے۔ یہ کوئی ضرورت نہیں کہ ہم اپنے آپ شیر خاں کے منہ میں چلے جائیں۔"

یہ کہہ کر راجہ مینڈک ایک سایہ دار جگہ پسند کر کے لیٹ گیا۔ بھینسیں اُس کے قریب چرتی رہیں۔ اور وہ سو گیا۔ ہندوستان میں ایک چرواہے کا جتنا وقت بیکاری میں گذرتا ہے اتنا دنیا میں کسی پیشہ ور کا نہ گذرتا ہوگا۔ گائیں بھینسیں آہستہ آہستہ چراگاہ میں پھرتی ہیں اور تھوڑی دیر چر کر بیٹھ جاتی ہیں۔ اُن کے ڈکارنے کی آواز بھی اکثر سننے میں نہیں آتی۔ گائے بیل البتہ بعض دفعہ کسی قدر پکارتے ہیں لیکن بھینسیں تو بالکل نہیں بولتیں ان کا یہ کام ہے کہ جہاں انہوں نے کوئی ڈابر دیکھا جھٹ اُس میں ایک ایک کر کے اُتر پڑیں اور اپنا تمام جسم پانی اور کیچڑ میں چھپا لیا۔ یہاں تک کہ اُن کی ناک اور آنکھیں پانی کی سطح پر نظر آتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا سیاہ رنگ کے لٹھے پڑے ہوئے ہیں۔ سورج کی گرمی سے چٹانیں جل اُٹھتی ہیں۔ اور نوخیز چرواہے کسی چیل کی سیٹی کی سی آواز اوج ہوا پر سنتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اگر گلہ کی کوئی گائے بھینس مر گئی تو یہ چیل جو اب قریب قریب نگاہ سے غائب ہے چشم زدن میں جھپٹا مار کر تیر کی طرح نیچے آئیگی اور اُسے نیچے اُترتا ہوا دیکھ کر دوسری چیل جو کئی میل کے فاصلہ پر ہوگی آجائیگی اور اُن کی دیکھا دیکھی اور بہت سی چیلیں آنی شروع ہونگی حتیٰ کہ جانور کے دم نکلنے سے پہلے بیسیوں بھوکی چیلیں آکر موجود ہو جائینگی اور جمع ہو کر اُسکے گرد اس انتظار میں منڈلانے لگینگی کہ کب یہ مرے اور ہمارا پیٹ بھرے۔ غرضکہ اس طپش کے عالم میں چرانے والے لڑکے بھی کسی درخت کی چھاؤں میں پڑ کر سو جاتے ہیں اور کچھ دیر کے بعد جاگ اُٹھتے ہیں۔ اور اپنے جانوروں کو سستی کی حالت میں لیٹا ہوا پا کر پھر سو جاتے ہیں اور خوب نیند لینے کے بعد اُٹھ کر سوکھی ہوئی گھاس اور پتلی پتلی ٹہنیوں کی ٹوکریاں بن کر اپنا دل بہلاتے ہیں یا دو ٹڈوں کو پکڑ کر انہیں آپس میں لڑاتے ہیں یا جنگلی پھولوں کو جمع کر کے اُن کا ہار پروتے ہیں۔ یا کسی گرگٹ کو چٹان پر لیٹا ہوا دیکھتے ہیں یا جوہڑ کے کنارے کوئی سانپ کسی مینڈک کا شکار کر رہا ہوتا ہے تو اُس کا تماشا دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ پھر وہ لمبے لمبے گیت اپنے عجیب سُروں میں گاتے ہیں۔ دن اتنا بڑا

ہو جاتا ہے کہ کسی طرح کٹنے ہی میں نہیں آتا۔ اس لئے وہ مٹی کا قلعہ تیار کر کے اُس میں مٹی کے آدمی اور گھوڑے اور بھینسیں بنا کر رکھتے ہیں اور آدمیوں کے ہاتھ میں سرکنڈوں کی تلواریں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم راجہ ہیں اور یہ ہمارا لاؤ لشکر ہے۔ کہیں خدا خدا کر کے شام ہوتی ہے اور تب لڑکوں کے پکارنے پر بھینسیں کیچڑ میں سے نکل آتی ہیں اور یہ سب کے سب میدان کو طے کرتے ہوئے گاؤں کی طرف جہاں ہر ایک جھونپڑے میں سے دھواں اُٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور دیئے جل رہے ہوتے ہیں رُخ کرتے ہیں۔

راجہ مینڈک ہر روز بھینسوں کو اسی طرح جنگل میں چرانے کے لئے لیجایا کرتا تھا اور ہر روز اُسے خاکی بھائی میدان میں میل ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر نظر آتا جس سے اُس کو معلوم ہو جاتا کہ شیر خاں ابھی تک واپس نہیں آیا۔ بھینسوں کے چرتے وقت راجہ مینڈک گھاس پر لیٹ کر ہر روز کوہ و صحرا کی انواع و اقسام کی صداؤں کو سُنا کرتا اور اُس گذرے ہوئے زمانہ کو یاد کیا کرتا جبکہ وہ جنگل میں رہا کرتا تھا۔ ان دنوں بین گنگا کے کنارے جنگل میں اگر شیر خاں کے لنگڑے پاؤں کی ذرا بھی آہٹ ہوئی ہوتی تو راجہ مینڈک اُسے سُن لیتا۔

آخر کار وہ دن آپہنچا جبکہ راجہ مینڈک نے خاکی بھائی کو مقام مقررہ پر نہیں دیکھا۔ اس علامت سے یہ نتیجہ نکال کر کہ شیر خاں واپس آگیا ہے راجہ مینڈک بھینسوں کو ہانکتا ہوا اُس نالے کی طرف لیگیا جس کے کنارے ڈھاک کا درخت سُرخ رنگ کے پھولوں سے لدا ہوا کھڑا تھا۔ اور جہاں خاکی بھائی سے ملنے کی اُس کی قرارداد ہوئی تھی چنانچہ اُس نے خاکی بھائی کو درخت کے نیچے اپنا منتظر پایا۔ خاکی بھائی کی پیٹھ کا ہر ایک بال کھڑا تھا۔ اور اُس کی وضع سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی نہایت متوحش بات کہنے والا ہے۔ ہانپ کر اُس نے راجہ مینڈک سے کہا۔

"تجھے غافل کرنے کے لئے وہ ایک مہینہ تک چھپا رہا ہے۔ گئی رات وہ پہاڑیوں کے سلسلہ کے اُس پار تیرا سُراغ لگانے کو آیا اور طباقی اُس کے ہمراہ تھا"

راجہ مینڈک نے ماتھے پر بل ڈال کر جواب دیا "میں شیر خاں سے تو نہیں ڈرتا مگر طباقی کی مکاری

سے ڈرتا ہوں۔"

خاکی بھائی ہونٹ چاٹ کر بولا" بیٹا ڈرمت اندیشہ کی کوئی بات نہیں۔ طباقی سے میں آج گھوم ملا تھا مجھے اُس کی زبانی سب کیفیت معلوم ہوگئی۔ شیر خاں کا ارادہ یہ ہے کہ گاؤں کے پھاٹک کے قریب آج شام کو تاک لگائے بیٹھا رہے اور جب تو وہاں پہنچے تو تجھے اُٹھا کر لیجائے۔ اسوقت وہ اُن درہ نما گھاٹیوں کے بیچ جن میں سے وین گنگا گذرتی ہے۔ ندی کی خشک تہ میں لیٹا ہوا ہے۔"

راجہ مینڈک نے متفکر ہو کر پوچھا "آج اُس نے کچھ کھایا بھی ہے یا بھوکا ہی ہے" اِس سوال کے جواب پر اُس کی زندگی یا موت کا دارومدار تھا۔

خاکی بھائی نے کہا" آج صبح اُس نے ایک سور کا شکار کیا اور پیٹ بھر کر اُس کا گوشت کھایا اور اس کے بعد خوب پانی پیا۔ کیا تم اُس پیٹو شیر خاں سے واقف نہیں ہو۔ اُس کے مذہب میں انتقام کی خاطر بھی بھوکا رہنا روا نہیں۔"

یہ سُنتے ہی راجہ مینڈک کی باچھیں کھِل گئیں اور وہ خوش ہو کر بولا" کیا احمق ہے۔ دنیا میں ایسے بیوقوف بھی کم ہوں گے۔ پیٹ بھر کھا پی لیا اور اسپر اُس کو یہ خیال ہے کہ میں اُس وقت تک ٹھیرا رہونگا جب تک کہ وہ سو کر چاق چوبند نہ ہو جائے! اگر ہم دس بھی ہوتے تو جہاں وہ لیٹا ہوا ہے اُٹھتے اُٹھتے اُس کے تکے بوٹیاں کر ڈالتے۔ یہ بھینسیں اُس وقت تک اُس پر حملہ نہ کرینگی جب تک کہ اُس کی بو اُنہیں نہ آجائے۔ افسوس کہ میں بھینسوں کی بولی نہیں جانتا۔ ورنہ انہیں سب کچھ سمجھا دیتا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ شیر جس رستہ سے گیا ہے میں اُسی رستہ سے ان بھینسوں کو لیجاؤں تاکہ وہ اُس کی بو پا جائیں ؟"

خاکی بھائی نے جواب دیا" اسی خیال سے وہ خشکی کے راستہ سے نہیں گیا بلکہ دُور تک وین گنگا میں تیرتا ہوا چلا گیا اور پھر کنارہ پر اُتر پڑا۔"

اس پر راجہ مینڈک اُنگلی دانتوں میں دبا کر کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر بولا" مجھے یقین ہے کہ یہ بات اُسے طباقی نے بتائی ہے ورنہ خود وہ ایسا کہاں کا عقلمند تھا کہ ایسی ترکیب اُسے بے سمجھائے

سوجھ جاتی۔ تم نے یہی کہا ہے نہ کہ وہ اس وقت اُس درہ میں موجود ہے جس میں سے وین گنگا گذرتی ہے؟ یہ درہ یہاں سے کوئی نصف میل کے فاصلہ پر میدان سے جاملتا ہے۔ میں گلہ کو ہانکتا ہوا درہ کے مُنہ پر لے جاتا ہوں اور وہاں سے اُس پر حملہ کرتا ہوں لیکن وہ دوسری طرف سے نکل جائے گا ہمیں یہ راستہ بھی روکنا چاہئے۔ خاکی بھائی کیا تم اتنا کرسکتے ہو کہ بھینسوں کے اس گلّے کو دو حصوں میں تقسیم کردو"

خاکی بھائی نے کہا" شاید میں اکیلا تو اس کام کو انجام نہ دے سکوں۔ لیکن میں ایک تجربہ کار معاون کو ساتھ لایا ہوں" یہ کہہ کر وہ بھاگتا ہوا گیا اور ایک بھٹ کے اندر داخل ہوا۔ تھوڑی دیر میں ایک دوسرے بہت بڑے بھیڑئیے نے جس سے راجہ مینڈک بخوبی واقف تھا سوراخ میں سے سر نکالا اور جنگل دوپہر کے وقت اُس کی شکار کی چیخ سے گونج اُٹھا۔

راجہ مینڈک نے تالیاں بجا کر کہا" اخاہ بھائی اکیلے تم تو خوب آئے۔ میں جانتا تھا کہ تم مجھے وقت پر نہ بھولوگے۔ ہمیں آج ایک بہت بڑی مہم سر کرنی ہے۔ بھائی اکیلے تم اس گلّے کو دو حصوں میں تقسیم کردو بھینسیں اور اُن کے کٹڑے تو ایک طرف ہوں اور بھینسے ایک طرف"

دونوں بھیڑیوں نے اُس وقت اس طرح دوڑنا شروع کیا کہ جھپٹتے ہوئے گلہ کے بیچ میں گھُس جاتے اور دوسری طرف نکل کر ایک چکر کاٹنے کے بعد گلہ کو پھر چیرتے ہوئے گذرتے گلہ کے جانوروں نے اپنے سر اوپر اُٹھائے اور خراٹے بھر کر وہ دفعتہً دو ٹکڑیوں میں تقسیم ہوگئے۔ ایک ٹکڑے میں بھینسیں اپنے کٹڑوں کو بیچ میں لیکر کھڑی ہوگئیں اور آنکھیں نکال کر بھیڑیوں کی طرف دیکھنے لگیں کہ ان میں سے کوئی ذرا رُکے تو اپنے کھُروں کے نیچے روند کر اُس کا دم نکالدیں دوسری ٹکڑی میں بھینسے غصہ سے نتھنوں کو پھُلانے اور کھُروں کو زمین پر مارنے لگے۔ اور اگرچہ دوسری ٹکڑی دیکھنے میں زیادہ شاندار اور زبردست معلوم ہوتی تھی لیکن دراصل وہ اس قدر خوفناک نہ تھی جتنی کہ بھینسوں والی ٹکڑی کیونکہ اُس کے ذمہ کسی کٹڑے کی حفاظت نہ تھی۔ چھ آدمیوں نے بھی مل کر گلہ کو اس صفائی سے دو حصوں میں تقسیم نہ کیا ہوتا۔

اکیلا ہانپ کر بولا "اب کیا حکم ہوتا ہے؟ دونوں ٹکڑیاں پھر ملجانے کی کوشش کر رہی ہیں"

راجہ مینڈک ایک جست بھر کر راما کی پیٹھ پر سوار ہو گیا اور کہنے لگا "اکیلے تو نروں کو ہانکتا ہوا بائیں طرف لیجا۔ اور خاکی بھائی تیرا یہ کام ہے کہ جب ہم جا چکیں تو بھینسوں کو درہ کے دامن کے اندر داخل کر دے"

خاکی بھائی نے ہانپ کر اور دانت بجا کر پوچھا "رہ کے اندر نہیں کتنی دُور تک لیجاؤں"

راجہ مینڈک نے پُکار کر جواب دیا "وہاں تک لیجا جہاں گھاٹیوں کے کراڑے اسقدر بلند ہوں کہ شیر خاں اُن پر سے کود کر باہر نہ نکل سکے اور جب تک ہم نہ پہنچیں اُس وقت تک اُنہیں وہاں روکے رکھ"

اس وقت اکیلا للکارا اور نر بھینسوں نے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ جھپٹنا شروع کیا۔ خاکی بھائی بھینسوں کا آگا روک کر کھڑا ہو گیا اور جب اُنہوں نے اُسپر حملہ کیا تو وہ اُن کے آگے بھاگتا ہوا درہ کے دامن کی طرف چلا گیا۔ دوسری طرف اکیلا نروں کو ہانکتا ہوا بائیں طرف درہ کے مُنہ کی سمت میں لیجا رہا تھا۔

راجہ مینڈک نے چلا کر کہا "واہ اکیلے کیا کہنے ہیں تیرے بھینسے کیا تیزی سے جھپٹے ہوئے جا رہے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا ہانکنا کالے ہرن کے ہانکنے سے بھی زیادہ مشکل ہے اکیلے تجھے یہ خیال بھی ہو سکتا تھا کہ یہ جانور ایسی تیزی سے دوڑ سکتے ہیں"

اُڑتی ہوئی خاک میں اکیلا ہانپ کر بولا "اپنی جوانی کے دنوں میں میں نے ان کا بھی شکار کیا ہے۔ کیا میں ان کا رُخ اب جنگل کی طرف کر دوں؟"

راجہ مینڈک نے پُکار کر جواب دیا "ہاں جس قدر جلد ممکن ہو اُن کا رُخ جنگل کی طرف کر دے۔ راما مارے غصہ کے بیتاب ہو رہا ہے کاش میں اس کی بولی میں اُسکو یہ بتا سکتا کہ مجھے تجھ سے آج یہ کام لینا ہے"

اس وقت بھیڑئے نے بھینسوں کا رُخ دہنی طرف کر دیا اور وہ جھاڑیوں کو پامال کرتے ہوئے

ایک رَو کی طرح آگے کو چھوٹے۔ راجہ مینڈک کے ہمراہ جو دوسرے لڑکے جو بھینسیں چرانے کے لئے آئے تھے وہ گاؤں کو یہ چلاتے ہوئے دَوڑے گئے کہ بھینسیں دیوانی ہو کر کسی طرف بھاگ گئی ہیں لیکن راجہ مینڈک یہ ترکیب نہایت سادہ تھی اور وہ یہ کہ ایک بڑا چکّر کاٹ کر اُس مقام پر پہنچ جائے جہاں سے دَرہ شروع ہوتا تھا اور پھر بھینسوں کو اُس میں لیجا کر شیر خاں کو اس طرح گھیرے کہ اُسے کسی طرف مفر نہ ملے۔ کیونکہ اُس کو یہ بات خوب معلوم تھی کہ پیٹ بھر کر کھا پی چکنے کے بعد شیر خاں کی حالت ایسی ہوگی کہ نہ وہ لڑ سکے گا اور نہ گھاٹی کے پہلو پر چڑھ سکے گا۔ اِس قدر بڑا چکّر کاٹنے سے راجہ مینڈک کا یہ مقصد تھا کہ شیر خاں کو کہیں اس امر کی اطلاع نہ ہو جائے کہ اُس کے برخلاف یہ سازش ہو رہی ہے کیونکہ اگر بھینسوں کی اِس غیر معمولی دَوڑ بھاگ کا شور شیر سُن لیتا تو وہ بچ کر نکل جاتا۔ آخر کار تین چار میل کا چکّر لگانے کے بعد راجہ مینڈک بھینسوں کو چمکارتا پچکارتا ہوا منزلِ مقصود پر لایا جہاں سے دو گھاٹیاں کچھ کچھ فاصلہ سے ایک دوسرے کے متوازی شروع ہو کر کچھ دور تک چلی گئی تھیں۔ اِس درہ کی دوسری طرف خاکی بھائی بھینسوں اور کٹڑوں کی دُوسری ٹکڑی کو روکے کھڑا تھا۔ راجہ مینڈک نے نہایت اطمینان کی نگاہ سے دیکھا کہ گھاٹیوں کے پہلو قریب قریب دیوار کی طرح عمود دار ہیں اور اُن پر جو بیلیں اور پودے اُگے ہوئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ کوئی شیر جوان کے سہارے اِن گھاٹیوں پر چڑھ کر دوسری طرف نکلجانا چاہتا ہی نہیں نکل سکتا۔

اس وقت راجہ مینڈک نے ہاتھ اُٹھا کر بھیڑیئے سے کہا "اکیلے ان کو ذرا دم لے لینے دے۔ ابھی تک انہیں شیر خاں کی بُو نہیں آئی میں شیر خاں سے اب کہے دیتا ہوں کہ خبردار ہو جائیے ہم آتے ہیں۔ اِس پھندے سے اُس کا نکلنا اب محال ہے۔"

یہ کہہ کر وہ باآوازِ بلند پُکارا۔ کسی سُرنگ میں پُکارنے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہی کیفیت اُس وقت بھی پیدا ہوئی اور ٹیکرے اور گھاٹیاں گونج اُٹھیں۔ اس پر کچھ دیر گذر گئی اور شیر خاں نے اپنی گہری نیند سے جاگ کر ایک ایسی آواز میں جس سے صاف پایا جاتا تھا کہ اُس کے معدہ میں اب تل بھر کی اور گنجائش نہیں غرّا کر جواب دیا کہ یہ کون پُکار رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک مور

اپنے لاجوردی پروں کو پھڑپھڑا کر شور مچاتا ہوا اوپر اُڑا۔

راجہ مینڈک نے جواب میں کہا "کیا میری آواز کو تو نہیں پہچانتا؟ میں ہوں راجہ مینڈک! اے نابکار اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ تیری کھال مجلس شوریٰ کے ٹھیکرے پر بچھے۔ بھائی لکیلے بڑھا ان بھینسوں کو!"

بھینسوں کا گلہ کچھ دیر کے لئے درہ کے منہ پر رُکا۔ لیکن لکیلے نے اس زور سے اپنا شکاری نعرہ مارا کہ بھینسے خوف کھا کر یکے دیگرے بے تحاشا دوڑ پڑے۔ ایک دفعہ دوڑ پڑنے کے بعد اُن کا رُکنا آسان نہ تھا اور وہ زیادہ دُور نہ گئے تھے کہ راما کو شیر خاں کی بو آئی اور وہ زور سے ڈکارا۔

راجہ مینڈک جو راما کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا تھا بولا "اہا ہا ہا! اب تو سمجھا!" غرضکہ بھینسے آنکھیں نکالے اور مُنہ میں کف لائے ہوئے سیلِ بلا کی طرح آگے کو جھپٹے۔ یہ وہ خوفناک حملہ تھا جس کی تاب لانے کی کسی شیر کو امید نہیں ہو سکتی۔ شیر خاں نے بھینسوں کے کھُروں کی ڈپٹ کی گرج سُنی اور گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ بھاری بھاری پاؤں رکھتا ہوا وہ داہنے بائیں راہ فرار ڈھونڈھتا آگے بڑھا لیکن دونوں طرف کی گھاٹیاں دیوار کی طرح سیدھی کھڑی تھیں اور بھرے ہوئے پیٹ کی گرانی کے باعث وہ یہی چاہتا تھا کہ اس وقت کسی طرح مجھے لڑنا نہ پڑے جس ڈابر کے کنارے سے وہ ابھی اُٹھ کر گیا تھا بھینسے اُس کو کھنگالتے ہوئے طوفان کی طرح گذرے اور اُنہوں نے اس زور سے ڈکاریں لیں کہ درہ کی تنگنائے گونج اُٹھی۔ راجہ مینڈک نے جواب میں درہ کے دوسری طرف سے بھینسوں کو ڈکارتے سُنا اور شیر خاں کو پلٹتے دیکھا۔ شیر کو خوب معلوم تھا کہ اگر جان پر ہی آبنی تو بھینسوں اور اُن کے کٹڑوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے بہتر تھا کہ نروں کا مقابلہ کیا جائے۔ اُس وقت راما نے ٹھوکر کھائی اور کچھ دیر کے لئے لڑکھڑایا لیکن پھر سنبھلا اور کسی نرم سی چیز کے اوپر سے گذرا اور کچھ دیر میں باقی نروں کے ساتھ جو اُس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے اُن بھینسوں میں جا ملا جو درے کے دوسرے کنارے پر کھڑی تھیں۔ یہ تلہ دونوں گلوں کو میدان میں لے گیا۔

راجہ مینڈک جو موقعہ کا منتظر تھا فوراً راما کی پیٹھ پر سے کود پڑا اور اپنی لاٹھی بھینسوں پر دائیں بائیں برسانے لگا اور چلّا کر بولی راما اکیلے جلد ان کو منتشر کردے ورنہ آپس میں ان کی لڑائی شروع ہو جائے گی ۔"

اکیلا اور رفاکی بھائی دوڑ دوڑ کر بھینسوں کی ٹانگوں کو کاٹنے لگے اور گودرہ کا رُخ کر کے گلہ ایک دفعہ پھر حملہ کرنے کے لئے پلٹا لیکن راجہ مینڈک نے راما کا منہ دوسری طرف پھیر دیا۔ اور باقی جانور بھی اُس کے پیچھے پیچھے ڈابروں میں لوٹ لگانے کو ہو لیے۔

شیر خاں کو اب زیادہ پامال ہونے کی احتیاج نہ تھی۔ اُس کا دم نکل چکا تھا اور چیلیں ابھی سے اُس کی لاش پر منڈلا رہی تھیں۔

راجہ مینڈک انسانوں میں بود و باش اختیار کرنے کے زمانہ سے ایک چاقو ہمیشہ اپنے پاس رکھتا تھا جو اُس کے گلے میں لٹکا رہتا تھا۔ اس چاقو کو اس وقت غلاف میں سے نکالکر وہ بولا "بھائیو یہ شیر خاں بھی کیا کتے کی موت مرا ہے۔ لیکن خواہ کچھ بھی ہوتا مجھے اس کی بزدلی سے یہ اُمید ہرگز نہ تھی کہ وہ برسر مقابلہ آئیگا۔ اُس کی کھال مجلس شوریٰ کے ٹیکرے پر بچھی ہوئی کیا ہی بھلی معلوم ہوگی۔ اب ہمیں اپنا کام جلد کرنا چاہیئے ۔"

کسی آدمیوں میں پلے ہوئے لڑکے کو ایک دس فٹ لمبے شیر کی کھال کے تن تنہا کھینچنے کا خیال بھی دل میں نہ گذرتا لیکن راجہ مینڈک کے لئے اس قسم کا کام کچھ نیا نہ تھا۔ تاہم کام مشکل تھا اور راجہ مینڈک ایک گھنٹہ تک اپنے چاقو سے چیر پھاڑ کرتا اور ہانپتا رہا۔ بھیڑئے زبانیں نکالے ہوئے اُس کے پاس بیٹھے تھے اور وقتاً فوقتاً اُس کے حکم پر آگے بڑھ کر کھال کو کھینچتے تھے کچھ دیر نہ گذری تھی کہ اُسے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا اور جب اُس نے پلٹ کر دیکھا تو بلدیو کو ہاتھ میں بندوق لئے اپنے سر پر کھڑا پایا۔ لڑکوں نے گاؤں میں جاکر بھینسوں کے بھاگ جانے کا ماجرا بیان کیا تھا اور بلدیو ناراض ہو کر اس خیال سے باہر نکلا تھا کہ راجہ مینڈک کو جاکر اس بات کی تنبیہ کرے کہ آیندہ وہ گلے کی زیادہ احتیاط رکھے۔ بھیڑیوں نے جب اُسے آتے

دیکھا تو دُور سرک گئے۔

بلدیو نے خفا ہو کر کہا۔" یہ کیا حماقت ہے؟ کیا تو سمجھتا ہے کہ دوسرے کی مدد کے بغیر کیلا ایک شیر کی کھال کھینچ لیگا؟ سچ سچ بتا کہ بھینسوں نے اسے کہاں مارا تھا؟ اور یہ تو ہے بھی وہ لنگڑا شیر جس کے مارنے والے کے لئے سرکار سے ایک سو روپیہ کا انعام مقرر ہے۔ خیر میں تیری خطا معاف کردوں گا کہ تو نے بھینسوں کو بھاگ جانے دیا اور کنھی واڑہ میں جب میں اس کی کھال لے جاؤں گا تو جو انعام مجھے ملے گا اُس میں سے تجھے بھی ایک روپیہ دونگا۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنے فتوی میں سے چقماق نکالی اور شیر خاں کی مونچھوں کے بال جلانے کے لئے نیچے جھکا۔ ہندوستان کے اکثر شکاری شیر مارنے کے بعد اس کی مونچھیں اس خیال سے جھلس دیا کرتے ہیں کہ کہیں اُس کی روح اُنہیں بعد میں آکر نہ ستائے۔

راجہ مینڈک نے بلدیو کی اِن باتوں کی طرف کچھ التفات نہ کیا اور برابر اپنے کام میں مشغول رہا۔ لیکن طنز کے لہجہ میں بلدیو سے اُس نے اتنا ضرور کہا۔" ہاں تو تیرا یہ قصد ہے کہ اِس کھال کو تو کنھی واڑہ لے جائے اور جو انعام تجھے ملے اُس میں سے مجھے بھی ایک روپیہ دے۔ لیکن میں تجھ سے کہتا ہوں کہ میرا قصد یہ ہے کہ اِس کھال کو اپنے کام میں لاؤں اد بڈھے اِس آگ کو ہٹا لے۔

اس پر بلدیو نے جھلا کر کہا۔" تو کل کا لونڈا ہو کر مجھ سے تین پانچ کرتا ہے! شیر کیا مار لیا کہ اب ہم جیسے شکاریوں سے بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے لگا اور رہا ابھی شیر کو تو نے نہیں بلکہ تیری خوش قسمتی اور تیری بھینسوں کی بے تمیزی نے۔ شیر نے ابھی کھانا کھایا تھا ورنہ وہ اب تک بیس میل نکل گیا ہوتا۔ تجھے اُس کی کھال کھینچنی تک تو ٹھیک نہیں آتی اور مجھ سے کہتا ہے کہ اس کی مونچھوں کو مت جلا۔ اب میں تجھے انعام میں سے ایک آنہ بھی نہیں دوں گا۔ دوں گا تو صرف پانچ چھ تھپیڑ۔ چل پرے ہٹ اور اس لاش کو چھوڑ۔"

راجہ مینڈک نے جواب دیا۔" قسم ہے مجھ کو اُس بیل کی جس کی وجہ سے میری جان بچی

کو میں اس بات کی تاب نہیں لا سکتا کہ ایک بڈھے کھوسٹ کی لنگوروں کی سی جڑجڑ ٹھیروں سُنا کروں۔ اکیلے یہ آدمی مجھے ستا رہا ہے۔ اس کی خبر تو لے ڈال؛

یہ بات راجہ مینڈک کے مُنہ سے نکلی ہی تھی کہ بلدیو نے جو ابھی تک شیر خاں کے سر پر جھکا ہوا تھا اپنے آپ کو گھاس پر چاروں شانے چت پڑا اور ایک خاکی رنگ کے بھیڑئے کو اپنے سینے پر کھڑا پایا۔ ادہر راجہ مینڈک اپنے کھال کھینچنے کے شغل میں بدستور اس طرح سے مصروف رہا گویا کہ تمام ہندوستان میں اُس وقت سوائے اُس کے اور کوئی شخص موجود نہ تھا طنز کے طور پر اُس وقت اُس نے یہ کہا۔

"بلدیو تیری بات بالکل ٹھیک ہے تجھے ہرگز یہ موقعہ نہیں ملے گا کہ انعام میں سے ایک آنہ بھی مجھے تو دے۔ اس لنگڑے شیر میں اور مجھ میں مدت سے عداوت چلی آرہی ہے اور آخر کار فتح مجھی کو حاصل ہوئی ہے"

انصاف کی بات یہ ہے کہ بلدیو اگر دس سال اور چھوٹا ہوتا اور اکیلے کی اُس سے جنگل میں مُٹ بھیڑ ہوئی ہوتی تو وہ بھی اپنا وار ضرور کرتا لیکن ایک ایسا بھیڑیا جو اس مردم خوار شیروں سے عداوت رکھنے اور جنگ کرنے والے لڑکے کے اشارہ پر چلتا تھا کوئی معمولی جانور نہیں ہو سکتا تھا۔ بلدیو نے خیال کیا کہ یہ ضرور جادو ہے اور اپنی جان کے اس وقت اُسے ایسے لالے پڑ گئے کہ جو تعویذ اُس کے گلے میں پڑا تھا اُس کی نسبت بھی اُسے شبہ ہونے لگا کہ اس آڑے وقت میں مجھے یہ بچاتا ہے یا نہیں۔ وہ دم بخود ہو کر زمین پر پڑا رہا اور یہی خیال اُس کے دماغ میں سمایا ہوا تھا کہ راجہ مینڈک بھی مسخ ہو کر شیر کے قالب میں اب ظاہر ہوا۔ اب ظاہر ہوا۔

آخر کار اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا "مہاراج!"

راجہ مینڈک نے نہایت بے اعتنائی سے بغیر سر اُٹھائے کہا "کہہ کیا کہتا ہے"

بلدیو نے گڑگڑا کر جواب دیا "میں ایک بڈھا آدمی ہوں۔ میں نہ جانتا تھا کہ مہاراج ایسے بلوان ہیں۔ مہاراج اگر آگیا دیں تو میں اُٹھ کر چلا جاؤں ورنہ مہاراج کا نوکر میرے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیگا"

راجہ مینڈک نے کہا "اچھا جا مگر خبردار جو تو نے پھر میری کسی بات میں دخل دیا۔ لے کیلے اسے جانے دے۔"

بلدیو اُٹھکر گرتا پڑتا گاؤں کی طرف بھاگا اور کبھی کبھی مُڑکر اس خیال سے پیچھے بھی دیکھتا جاتا تھا کہ کہیں راجہ مینڈک کسی غضبناک شکل میں تبدیل نہ ہو جائے۔ جب وہ گاؤں میں پہنچا تو اُس نے لڑکے کی جادوگری اور فسوں سازی کا ایک ایسا حیرت انگیز قصہ بیان کیا کہ مہنت ششدر رہ گیا۔

راجہ مینڈک نے اپنا کام بدستور جاری رکھا مگر بھیڑیوں کی مدد سے وہ جب شیر کی پوری کھال کھینچ چکا تو آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ اس وقت راجہ مینڈک نے بڑے بھیڑئے سے مخاطب ہو کر کہا "اب مجھے اس کھال کو کہیں چھپا کر بھینسوں کو گھر لے جانا چاہئے۔ اکیلے مجھے اس میں ذرا مدد دے۔"

بھینسوں کا گلہ آہستہ آہستہ گاؤں کی طرف بڑھا اور جب وہ گاؤں کے قریب پہنچا تو راجہ مینڈک نے دیکھا کہ لوگوں کے ہاتھوں میں مشعلیں ہیں اور مندر میں گھنٹے اور سنکھ بج رہے ہیں پھاٹک کے پاس آدھا گاؤں اُس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ راجہ مینڈک نے اپنے دل میں کہا کہ چونکہ میں نے شیر مارا ہے اس لئے گاؤں میں خوشیاں ہو رہی ہیں اور لوگ میری پیشوائی کے لئے کھڑے ہیں۔ مگر جب وہ پھاٹک کے پاس پہنچا تو اُس پر پتھروں کی ایک بوچھاڑ ہوئی اور گاؤں والوں نے چلاّ کر کہا "او جادوگر! بھیڑئے کے بچے! جنگل کے بھوت! چلا جا یہاں سے خبردار جو ہمارے گاؤں میں گھُسا ورنہ ہمارا مہنت تجھکو پھر تیری اصلی بھیڑئے کی شکل میں بدل دے گا۔ بلدیو! مارا سے بندوق سے۔"

اس وقت بندوق کے چلنے سے ایک تڑاقا ہوا اور ایک جوان بھینس درد سے ڈکرا اُٹھی۔ گاؤں والے چلاّ کر بولے "دیکھا اس کا جادو۔ گولی بھی اس پر اثر نہیں کرتی۔ جادو کے زور سے گولی دوسری طرف پھیر دیتا ہے۔ بلدیو جس بھینس کو گولی لگی وہ تیری ہی بھینس تھی۔"

اب پتھر اور بھی زیادہ چلنے لگے اور راجہ مینڈک حیران و پریشان ہو کر بولا "یہ کیا ماجرا ہے؟"
اکیلے نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا "یہ تیرے بھائی بند بھی ہمارے غول کی سی خصلتیں رکھتے ہیں۔ اگر ان گویوں کے کچھ معنی ہیں تو میرا خیال ہے کہ وہ تجھ کو اپنی ذات برادری سے خارج کیا چاہتے ہیں۔"
اُس وقت پھر ایک شور برپا ہوا اور مہنت نے تلسی کے مقدس پودے کی ایک شاخ ہلا کر بلند آواز سے کہا "اے بھیڑئے کے بچے! چلا جا یہاں سے!"
راجہ مینڈک بولا "پچھلی مرتبہ میں اس لئے نکالا گیا کہ میں آدمی تھا اور اب اس لئے نکالا جا رہا ہوں کہ میں بھیڑیا ہوں۔ اچھا بھائی اکیلے آؤ یہاں سے چل دیں۔"
اس وقت ایک عورت (یہ میسوا تھی) مجمع میں سے بھینسوں کے گلہ کی طرف بھاگتی ہوئی آئی اور بے تاب ہو کر پکاری "اے میرے بیٹے لوگ کہہ رہے ہیں کہ تو جادوگر ہے اور جب چاہے درندہ کی شکل میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ مجھے اُن کا کہنا باور نہیں آتا۔ مگر پھر بھی تو یہاں سے چلا جا۔ ورنہ یہ لوگ تجھے جان سے مار ڈالیں گے۔ بلدیو کہتا ہے کہ تو جادوگر ہے مگر میں جانتی ہوں کہ تو نے ناتھو کی موت کا بدلہ لیا ہے۔"
لوگوں نے چلا کر کہا "میسوا واپس چلی آ ورنہ ہم پتھروں سے تجھے مار ڈالیں گے۔"
ایک پتھر آ کر راجہ مینڈک کے منہ پر لگا اور اُس نے میسوا سے یوں کہا "میسوا بھاگ۔ شام کے وقت بڑے درخت کے نیچے بیٹھ کر جو بیہودہ قصہ یہ لوگ کہا کرتے ہیں میری جادوگری کا قصہ بھی ویسا ہی ہے۔ میں نے تیرے بیٹے کا بدلا شیر سے لے لیا ہے۔ اب تو جلدی واپس جا۔ کیونکہ میں بھینسوں کو گاؤں میں اتنی تیزی سے بھیجوں گا کہ اُن کے پتھر بھی ایسے تیز نہیں آ سکتے۔ میسوا میں جادوگر نہیں ہوں۔ اب جا۔ الوداع۔"
یہ کہہ کر وہ اکیلے سے مخاطب ہوا اور بولا "اکیلے ایک دفعہ پھر وہی ہلہ ہو بھینسوں کے گلے کو لا۔"

بھینسیں خود گاؤں میں داخل ہونا چاہتی تھیں اور انہیں اکیلے کے نعرہ کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ بگولے کی طرح وہ پھاٹک کے بیچ میں سے گذریں اور بھیڑ پھٹ کر دائیں بائیں ہوگئی۔

راجہ مینڈک نے حقارت کے لہجہ میں چلّا کر کہا۔ "اپنی بھینسوں کو گن لو ممکن ہے کہ میں نے ان میں سے ایک آدھ چرالی ہو۔ خوب دیکھ بھال لو کیونکہ اب میں تمہاری بھینسوں کو نہیں چراؤنگا اے آدمی زادو خوش رہو۔ آباد رہو۔ میں تم سے رخصت ہوتا ہوں لیکن تم کو میسوا کا مشکور ہونا چاہئے۔ یہ اُسی کا طفیل ہے کہ میں تم سے کچھ نہیں کہتا ورنہ اور کوئی چیز مانع نہیں کہ اپنے بھیڑیوں کو ساتھ لاکر تم سب کے تکّے بوٹیاں کر ڈالوں"

یہ کہہ کر وہ پلٹا اور اکیلے کے ساتھ ساتھ وہاں سے چلدیا اور جب اُسنے سر اوپر اُٹھا کر ستاروں کی طرف دیکھا تو اُس کے دل کو اطمینان ہوا اور اُس نے خوشی سے کہا۔ "اکیلے اب میں پھر آزاد ہوگیا۔ راتوں کو پھندوں کے اندر سونے سے مجھے نجات ملی۔ چلو شیر خاں کی کھال لے کر یہاں سے چل دیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس گاؤں کو کوئی ضرر پہنچے۔ کیونکہ جبتک میں یہاں رہا میسوا ہمیشہ مجھ سے مہربانی کا برتاؤ کرتی رہی"

جب چاند نکلا اور میدان میں ایسا اُجالا ہوا کہ ہر ایک چیز صاف نظر آنے لگی تو گاؤں والوں نے خوف زدہ ہوکر دیکھا کہ راجہ مینڈک اپنے سر پر ایک گٹھڑی اُٹھائے بھاگا ہوا جارہا ہے اور دو بھیڑئے اُس کے پیچھے ہیں اس پر اُنہوں نے مندر کے گھنٹوں اور ناقوسوں کو اور بھی زیادہ زور سے بجانا شروع کیا اور بیچاری میسوا رونے لگی اور بلدیو نے اپنی جنگل کی سرگذشت پر حاشئے چڑھانے شروع کئے یہاں تک کہ اُس نے لوگوں سے اپنے قصہ کے آخر میں یہ بیان کیا کہ اکیلا اپنے پچھلے پاؤں کے بل کھڑا ہوکر آدمی کی طرح باتیں کرتا تھا۔

چاند ڈوبنے کے قریب تھا جب کہ راجہ مینڈک اور دونوں بھیڑئے مجلس شوریٰ کے ٹیکرے پر پہنچے اور بھیڑئے کی مادہ کے غار پر رُکے۔ راجہ مینڈک نے چلّا کر کہا۔ "آدمیوں کے غول نے مجھے اپنے میں سے خارج کر دیا ہے لیکن میں اپنے وعدہ کے مطابق شیر خاں کی

کھال لیکر آیا ہوں"

بھیڑئے کی مادہ غار میں سے اپنے بچوں کو لئے باہر نکلی اور جب اُس نے شیر کی کھال کو دیکھا تو اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور وہ اسطرح بولی "میرے ننھے مینڈک جس دن کہ شیر خاں نے اپنا سر اور کندھے اس غار میں تیری جان لینے کے لئے ٹھونسے تھے میں نے اُسی دن اُس سے کہہ دیا تھا کہ شکار افگن خود شکار ہوگا۔ شاباش بیٹا شاباش"

اس وقت جھاڑی میں سے کسی نے غرا کر کہا "بیٹا کیا کہنے ہیں تمہارے شیر کو تم نے خوب مارا۔ اور اچھا ہوا کہ تم آ گئے کیونکہ تم بن ہم جنگل میں اکیلے تھے" یہ چیتے کی آواز تھی جو بھاگا ہوا آیا اور راجہ مینڈک کے پاؤں چاٹنے لگا۔ پھر وہ سب کے سب مجلس شوریٰ کے ٹیکرے پر گئے اور راجہ مینڈک نے شیر کی کھال کو اُس بڑے پتھر پر بچھا دیا جس پر اکیلا بیٹھا کرتا تھا۔ اکیلا کھال پر لیٹ گیا اور جیسا کہ وہ راجہ مینڈک کے چٹان پر پہلی مرتبہ لائے جانے کی رات کو پکارا تھا اسیطرح اُس وقت پکار کر بولا "اے بھیڑیو خوب دیکھ بھال لو"

اکیلے کے معزول کئے جانے کے دن سے بھیڑیوں کے غول کا کوئی دوسرا سردار مقرر نہ ہوا تھا اور بھیڑئے اپنی مرضی کے مطابق شکار اور لڑائی پر جہاں اور جس وقت چاہتے تھے جاتے تھے۔ لیکن بہ مقتضائے عادت وہ اکیلے کے پکارنے پر آموجود ہوئے۔ ان میں سے بعض کے پاؤں میں تو پھندوں میں پھنس جانے کے باعث لنگ آ گیا تھا اور بعض گولی کا زخم کھانے کی وجہ سے لنگڑا کر چلتے تھے۔ بعض ایسے تھے جن کے بال بُری خوراک کھا کھا کر جھڑ گئے تھے اور بعض کا سرے سے پتہ ہی نہ تھا۔ بہر حال وہ جس قدر بھی تھے مجلس شوریٰ کے ٹیکرے پر اکیلے کی آواز سن کر آئے اور شیر خاں کی دھاری دار کھال کو اُنہوں نے چٹان پر بچھا ہوا پایا۔

راجہ مینڈک نے کہا "اے بھیڑیو خوب دیکھ بھال لو۔ میں اپنے قول پر قائم رہا ہوں یا نہیں؟"

اس کے جواب میں بھیڑیوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ "ہاں تم نے جو کچھ کہا تھا اُسے کر دکھایا" اور ایک تبہ حال بھیڑیے نے چیخ کر یہ کہا "اے اکیلے ہم تیری سرداری پھر تسلیم کرتے ہیں - اے آدمی زاد تو اکیلے کے ساتھ ہمارا سردار بننا قبول کر کیونکہ قانون کی خلاف ورزی کر کے ہمارا حال نہایت تباہ و پریشان ہو گیا ہے - اور ہم چاہتے ہیں کہ ہم ایک دفعہ پھر ویسی ہی آزاد قوم بن جائیں جیسے کہ پہلے تھے"

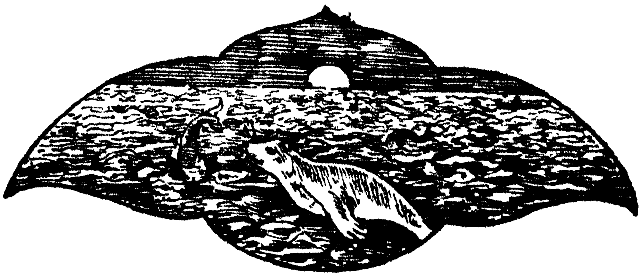
اِس پر چیتا غرّا کر بولا "بھلا اب یہ کیسے ہو سکتا ہے جب تمہیں پیٹ بھر کر کھانے کو ملیگا تو پھر تم سرکش ہو جاؤ گے - آزاد قوم والے جو تم کہلاتے ہو تو یہ کچھ بے وجہ نہیں ہے - تم مطلق العنان ہونے اور آزادی حاصل کرنے کے لئے لڑے تھے - اب تمہیں وہ آزادی حاصل ہے - اے بھیڑیو ذرا اس آزادی کا مزا چکھو"

راجہ مینڈک نے کہا "انسانوں کے غول اور بھیڑیوں کے غول دونوں نے مجھ کو اپنی جماعت سے نکال دیا - اب جنگل میں اکیلا شکار کروں گا"

بھیڑئے کی مادہ کے چاروں بچے بولے "اور ہم تیرے ساتھ مل کر شکار کرینگے"

غرضکہ راجہ مینڈک اُس دن سے جنگل میں بھیڑئے کے چاروں بچوں کے ساتھ مل کر شکار کرنے لگا - لیکن اُس کی تمام عمر اکیلے نہیں گذری کیونکہ کئی سال بعد جب وہ سنِ بلوغ کو پہنچکر مرد ہو گیا تو اُس نے شادی کر لی -

مگر وہ کہانی بڑوں کے سننے کی ہے - بچوں کو اُس سے دلچسپی نہیں ہو سکتی -



سفید دریائی بچھڑا

میرے بچے شور مت کر کہ رات اندھیری سر پر — پڑا مارتا ہے موجیں بڑے ٹھاٹھ سے سمندر
وہ کھلی افق کی کھڑکی وہ چمک کے چاند نکلا — لیا ہم کو دیکھ سوتے لب ساحل اس نے آکر
بنیں نیلی نیلی لہریں ترا نرم نرم تکیہ — بنا اُجلا اُجلا پانی ترا گرم گرم بستر
میرے پیارے ننھے بچے تو مزے سے پڑ کے سو — نہ تجھے بھنور کا خطرہ نہ تجھے نہنگ کا ڈر

(دریائی گائے کی لوری)

جو واقعات یہاں قلمبند کئے جاتے ہیں۔ وہ اب سے کئی سال پہلے ایک مقام میں جو نواس توشنہ کہلاتا ہے اور جو جزیرہ سینٹ پال واقع بحیرۂ بیرنگ کے شمال مشرقی گوشہ کا ایک حصہ ہے پیش آئے۔ یہ کہانی میں نے لمرشن نامی ایک آبی چڑیا کی زبانی سنی۔ جب میں ایک دُخانی جہاز میں جاپان کو جا رہا تھا تو ایک دن طوفان کے عالم میں یہ چڑیا ٹھٹھری ہوئی جہاز کے ایک رستے پر آکر بیٹھ گئی۔ میں اُسے اُٹھا کر اپنے حجرہ میں لیگیا اور ایک دو دن تک اُسکی خبرگیری

کرتا رہا یہاں تک کہ وہ اپنے وطن جزیرہ سینٹ پال کو پھر اُڑ کر واپس جانے کے قابل ہوگئی

کرشن ایک عجیب و غریب پرندہ ہے لیکن اُس کے صحیح الروایت ہونے میں کوئی کلام نہیں

نواس توشنہ میں کام کاج کرنے والوں کے سوا اور کوئی نہیں آتا۔ اور صرف دریائی بچھڑوں

کی ہی ایک ایسی قوم ہے جو باقاعدہ طور پر کاروبار کی غرض سے ہر سال یہاں آیا کرتی ہے۔

گرمی کے موسم میں ہزاروں لاکھوں دریائی بچھڑے اس مقام کو اپنی نزہت گاہ قرار دیتے ہیں

کیونکہ نواس توشنہ کا ساحل ایسا وسیع اور دل کشا ہے کہ دریائی بچھڑوں کے لئے دنیا میں اس

سے بہتر آرام گاہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ بحری صیاد اس بات کو خوب جانتا تھا اور اس نے

موسم بہار کے شروع ہوتے ہی وہ جس سمندر میں ہوتا وہاں سے تیرتا ہوا سیدھا نواس توشنہ کا رخ

کرتا۔ اور ساحل پر چٹانوں کے درمیان اپنے لئے کوئی اچھی جگہ حاصل کرنے کی غرض سے

مہینے بھر تک اپنے ساتھیوں سے لڑنے بھڑنے میں گذار دیتا۔ بحری صیاد ایک بہت بڑا

پوستین پوش دریائی سانڈ تھا جس کی عمر پندرہ سال کے قریب ہوگی۔ اُس کی گردن پر ایال تھی

اور اُس کے لمبے لمبے دانت خوب تیز تھے۔ جب وہ اپنے اگلے چپو کے سے پاؤں کو اوپر

اُٹھاتا تھا تو زمین سے چار فیٹ بلند ہو جاتا تھا اور اگر کسی کو یہ جرأت ہوتی کہ اُسے تولے تو اُسے

معلوم ہوتا کہ اُس کا وزن نو من کے قریب ہے۔ اُس کے تمام جسم پر زخموں کے نشان پڑے ہوئے

تھے لیکن وہ پھر بھی ایک دفعہ جان توڑ کر لڑنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ مقابلہ کے وقت وہ

اپنا سر ایک طرف کو پھیر دیتا جس سے دیکھنے والے کو یہ معلوم ہوتا کہ گویا وہ اپنے غنیم سے آنکھ

لڑاتے ہوئے ڈرتا ہے لیکن چشم زدن میں بجلی کی طرح تڑپ کر وہ اپنے زبردست دانت اپنے

حریف کی گردن میں ایسے گاڑتا کہ اُسے ادھ موا کر کے ہی چھوڑتا۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ بحری

صیاد کبھی ایسے دریائی بچھڑے کا تعاقب نہیں کرتا تھا جو ایک دفعہ پس پا ہو چکا ہوتا کیونکہ

اگر وہ ایسا کرتا تو ساحل کے قانون کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا مقصد اُس کا اس جدال

و قتال سے صرف اسی قدر تھا کہ اپنی بی بی بچوں کے لئے ساحل کے قریب کوئی محفوظ

اور راحت بخش نشیمن حاصل کرے۔ لیکن چونکہ ہر موسم بہار میں چالیس پچاس ہزار دریائی بچھڑے اسی مقصد سے یہاں آتے تھے اس لئے ساحل کے کنارے چیخ پکار اور شور وغل کی وہ کیفیت ہوتی تھی کہ سمندر کی موجوں کا جوش وخروش بھی اُس کے آگے ہیچ تھا۔ ایک چھوٹے سے ٹیکرے پر سے جو ہچنسن کی پہاڑی کے نام سے مشہور تھا تین چار میل تک میدان لڑتے ہوئے دریائی بچھڑوں سے ڈھکا ہوا دکھائی دیتا تھا اور دریائی بچھڑے موجوں میں اُسی طرح

"چو از ظرف دریا برآید نہنگ"

باہر سر نکال نکال کر معرکۂ کارزار میں شریک ہونے کے لئے بہ شوق تمام جاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ سینڈ کی جھال کے اندر ساحل کی ریت پر سنگ سماق کی گھسی ہوئی چٹانوں کے نشیمنوں میں۔ غرضکہ ہر جگہہ وہ نبرد آزمائی میں مصروف دکھائی دیتے تھے کیونکہ حماقت اور خود غرضی میں وہ انسانوں سے کچھ کم نہ تھے۔ اُن کی بیبیاں جزیرہ میں اواخر ماہ مئی یا اوائل ماہ جون تک نہیں آتی تھیں کیونکہ معرکۂ جدال وقتال میں شریک ہو کر اپنے پرزے اُڑوانے کی وہ کچھ ایسی طلبگار نہ تھیں۔ اور دو سال سے لیکر چار سال تک کی عمر کے نوخیز بچھڑے جو ابھی جورو کی قید سے آزاد تھے پانی سے نکل کر نصف میل کے فاصلہ تک بیکار جو بچھڑوں میں جاتے اور اُن کا ایک جم غفیر ریت پر کھیل تماشے میں مصروف ہوتا اور جہاں کہیں نباتات کی قسم سے ایک پتا بھی اُگا ہوا پاتا اُسے چٹ کر جاتا۔ ان بچھڑوں کو محروم کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ اور اُن کی تعداد تو اس توشنہ میں دو تین لاکھ ہوگی۔

بہار کی ایک فصل میں بحری صیاد اپنی اڑتالیسویں لڑائی ختم کر ہی چکا تھا کہ اُس کی نازک اندام اور مستانہ چشم بی بی جس کا نام مٹکو تھا سمندر میں سے نکل کر خراماں خراماں اپنے خاوند کی طرف بڑھی۔ بحری صیاد نے اپنی بی بی کو دیکھتے ہی اُس کی گردن دانتوں میں دبالی اور اس زور سے اُسے جھنجھوڑا کہ وہ نیچے گر پڑی۔ اس کے بعد اُس نے سختی سے یوں کہا۔

"ہمیشہ دیر لگا کے آتی ہے۔ اتنے دن تو کہاں رہی۔ بتا سچ سچ!"

بحری صیاد اپنے چار ماہہ زمانۂ قیام ساحل میں کچھ نہیں کھاتا تھا اور اس لئے اُس کا مزاج اس زمانہ میں اکثر چڑچڑا رہتا تھا۔ منکو کو یہ بات خوب معلوم تھی۔ اس لئے اُس نے خوشامد کے لہجہ میں بہ ملائمت یہ جواب دیا "تمہیں اپنے بال بچوں کی آسایش کا کس درجہ خیال ہے تم نے اپنا قدیم نشیمن پھر حاصل کر لیا۔"

اس فقرہ نے بحری صیاد کی طبیعت کے اشتعال کو کسی قدر فرو کر دیا۔ اور وہ بولا "میرا خیال تو ایسا ہی ہے۔ میری حالت نہیں دیکھتیں۔"

اُس کا تمام جسم لہولہان ہو رہا تھا۔ ایک آنکھ قریب قریب باہر نکل آئی تھی اور اُس کے پہلوؤں کی دھجیاں اُڑی ہوئی تھیں۔

منکو نے کہا "تم مردوں کی قوم بھی عجیب ہے۔ کیوں تم ہوش و فہم سے کام لیکر اپنی اپنی جگہ میں امن و فراغت کے ساتھ آباد نہیں ہو جاتے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ گویا تم وہیں پہلی سے لڑ رہے تھے"

بحری صیاد نے جواب دیا "مئی کے مہینہ کی ۱۵ تاریخ سے لیکر اب تک میں نے سوائے لڑنے کے اور کوئی کام نہیں کیا۔ اس دفعہ پر ساحل پر ایسا اژدہام ہے کہ کسی پہلی فصل میں نہ ہوا تھا۔ لوقنان کے ساحل کے سو دریائی بچھڑے میں نے یہاں آتے ہوئے دیکھے جو گھر کی تلاش میں تھے۔ مجھے حیرت ہے کہ لوگ کیوں اپنے گھر چھوڑ کر دوسروں کے گھروں میں مداخلت کرنے چلے آتے ہیں۔"

منکو بولی "مجھے اکثر خیال ہوا ہے کہ اگر ہم بجائے اس مقام کے جہاں اس قدر ہجوم ہے کہ ساحل پر تل رکھنے کو جگہ نہیں اود بلاؤ کے جزیرہ میں جا کر یہ موسم گذارا کریں تو ہم بڑے خوش رہیں"

بحری صیاد نے کہا "مجھے تمہاری اس رائے سے اتفاق نہیں۔ اود بلاؤ کے جزیرہ میں صرف مجرد دریائی بچھڑے جایا کرتے ہیں۔ اگر ہم وہاں جائیں تو وہ یہ کہیں گے کہ ہم نے ڈر کر وہاں پناہ لی۔ میری پیاری آخر ناموس بھی کوئی چیز ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اپنے نام کی لاج اور اپنے ظاہری رعب کو قائم رکھیں۔"

یہ کہہ کر بحری صیاد نے اپنا سر پیچھے جھکا لیا اور کچھ دیر کے لئے اپنے آپ کو سوتا بنا لیا لیکن کن انکھیوں سے وہ برابر دہنے بائیں نگاہ دوڑا رہا تھا تاکہ اگر کوئی سانڈ مبارز طلب کرے تو نعرہ مار کر اُس پر جھپٹ پڑے۔ ساحل پر اس وقت کم از کم دس لاکھ دریائی بچھڑے ہوں گے ان میں سن رسیدہ سانڈ۔ گائیں۔ ننھے بچھڑے اور نوخیز مجرد بچھڑے سبھی شریک تھے جن کے باہمی جنگ و جدل جد و جہد۔ شور و غل اور کھیل کود کی عجیب کیفیت تھی۔ ان کے گروہ کے گروہ پرے جمائے ہوئے سمندر کی طرف سے آتے تھے اور ساحل پر جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی اُنہیں کی صورتیں نظر آتی تھیں۔ اور دُھند اور کُہر میں اُن کا لڑنا بھڑنا برابر جاری تھا۔ نواس قرشنہ پر تقریباً ہمیشہ دُھند اور کُہر کا پردہ پڑا رہتا ہے۔ ہاں بعض دفعہ سورج اس پردہ کا ایک گوشہ اُٹھا دیتا ہے اور اُس وقت ہر ایک چیز تھوڑی دیر کے لئے موتیوں اور قوس قزح کی رنگت کی نظر آتی ہے

مٹکو کا بچہ کوٹک اسی حالتِ تشویر میں پیدا ہوا۔ پیدا ہونے کے وقت کوٹک محض ایک مضغۂ گوشت تھا جس میں سر اور گردن اور نیلگوں آنکھوں کے سوائے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ پیدائش کے وقت سب دریائی بچھڑوں کی یہی کیفیت ہوا کرتی ہے لیکن کوٹک کا پوستین ایسا عجیب تھا کہ اُس کی ماں کو دیکھ کر اچنبا ہوا۔

آخر کار وہ بولی "لو صاحب ہمارے بچے کی رنگت سفید ہے" بحری صیاد نے متعجب ہو کر کہا "مجھے باور نہیں آتا۔ دُنیا میں آجتک کسی دریائی بچھڑے کی رنگت سفید نہیں ہوئی"

مٹکو نے جواب دیا "پہلے نہ تھی تو اَب تو ہے۔ تم خود دیکھ لو"

یہ دیکھ کر اُس نے وہ گیت گانا شروع کیا جو تمام دریائی بچھڑوں کی مائیں اپنے بچوں کو لوری کے طور پر سُنایا کرتی ہیں"

میرے بچے مت قصد کر تیرنے کا　　نہ جب تک ہو سن دو مہینے کا تیرا
تو کھائے گا اِس طرح کی ورنہ ڈُبکی　　کہ ایڑی سے نیچے تیری ہو گی چوٹی
سمندر کے طوفاں سے بچ وہیل سے ڈر　　بُرا اس کا حملہ بُری اس کی ٹکر

خبردار یہ دونوں ہیں تیرے دشمن   یہ ہیں اِن دنوں ننھے بچھڑوں کے دشمن
ولیکن جہاں تک ہے پایاب پانی   تجھے چاہئے اُس میں طاقت بڑھانی
چلا اپنے تو ہاتھ اور پیر اُس میں   تو بے کھٹکے رات اور دن تیر اُس میں
لگے گا تجھے تیسرا جب مہینا   تو جب چھوڑ دے گا میرا دودھ پینا
بناؤں گی دریا کو میں تیرا گھوڑا   ترے ہاتھ میں لہر کا دوں گی ڈورا

ظاہر ہے کہ اوّل اوّل کوٹک کو اپنی ماں کے اِس گیت کے معنی سمجھ میں نہیں آئے اُس نے شروع شروع میں اپنی ماں کی نگرانی میں اپنے ہاتھوں سے پانی کو چپوؤں کی طرح چیرنا سیکھا اور جب اُس کا باپ کسی دوسرے دریائی سانڈ سے مصروف پیکار ہوتا اور دونوں حریف سلیٹ چٹانوں پر تلے اوپر ہوتے تو وہ ایک طرف کو ہٹ جاتا۔ مٹکو سمندر سے اپنے کھانے کا انتظام کرنے کے لئے جایا کرتی اور کوٹک کی کھلائی دو دن میں صرف ایک مرتبہ ہوتی۔ لیکن وہ اسی ایک مرتبہ میں اتنا ٹھونس کر کھا لیتا تھا کہ دو دن تک اُس کو پھر احتیاج نہیں ہوتی تھی پہلے اُس نے پانی میں سے نکل کر رینگتے رینگتے خشکی پر آنا سیکھا اور وہاں اُسے اپنی عمر اور اپنے قد و قامت کے ہزارہا بچے نظر آئے۔ یہ بچے کتے کے پلوں کی طرح آپس میں کھیلتے اور پاک صاف ریت پر پڑ کر سو جاتے اور جاگ کر پھر کھیلنے میں مصروف ہو جاتے۔ نشیمنوں میں جو سن رسیدہ دریائی سانڈ رہتے تھے اُن کو ان سے کچھ سروکار و تعرّض نہ تھا۔ اور نوجوان مجرد بچھڑے اپنے مسکنوں میں رہتے تھے۔ اس لئے بچوں کو کھیل کود کا اچھا موقعہ ملتا تھا۔

جب مٹکو سمندر سے مچھلیوں کا شکار کرکے واپس آتی تو وہ سیدھی بچوں کے کھیل کے میدان کی طرف جاتی اور جس طرح بھیڑ اپنے بچے کو بلاتی ہے اُسی طرح کوٹک کو پکارتی یہاں تک کہ وہ جواب میں ممیاتا۔ تب وہ سیدھا اُسی کا رُخ کرتی اور جو دوسرے بچے اُس کے رستہ

میں آتے تو اُنہیں پنجے مار مار کر گراتی ہوئی کونک کے پاس پہنچتی اور جو کچھ ساتھ لائی تھی وہ اُسے کھلاتی۔ بچوں کے تماشا گاہ میں اور بہت سی مائیں بھی آکر اپنے بچوں کو دیکھ بھال جاتی تھیں اور وہ دن دونی اور رات چوگنے پنپتے تھے۔ اس تربیت کے زمانہ میں ایک دفعہ کونک کی ماں نے اُس سے کہا بیٹا اگر تم میلے پانی میں نہیں نہاؤ گے اور تمہارے جسم پر جہاں زخم پڑ جائے یا خراش آ جائے اُس مقام کو ریت کے سخت ذروں کی رگڑ سے بچائے رکھو گے اور سمندر میں طوفان کے وقت نہیں تیرو گے تو تم سلامت اور محفوظ رہو گے۔

نوزائیدہ دریائی بچھڑے بھی انسان کے بچے کی طرح تیر نہیں سکتے۔ لیکن جب تک وہ تیرنا سیکھ نہیں لیتے اُس وقت تک اُنہیں قرار نہیں آتا۔ پہلی مرتبہ جب کونک سمندر میں تیرنے کی مشق کرنے کے لئے گھسا تو ایک موج اُسے اُٹھا کر گہرے پانی میں لے گئی اور جیسا کہ اُس کی ماں نے اُسے گیت میں بتایا تھا اُس کا سر نیچے ہو گیا اور ٹانگیں اوپر اُٹھ گئیں۔ اور اگر دوسری لہر اُسے لا کر ساحل پر نہ ڈال دیتی تو وہ ڈوب گیا ہوتا۔ اس کے بعد اُس نے ایسی جسارت نہیں کی بلکہ سمندر کے کنارے ایک ڈابر میں تیرنے کی مشق کرتا رہا اور جب کوئی بڑی لہر اُس کے قریب آتی تو اُسے دُور سے آتا ہوا دیکھ کر وہ جلدی سے پیچھے ہٹ جاتا۔ دو ہفتہ میں اُس نے اپنے چپوئی شکل کی جھلّی دار پنجوں کا استعمال سیکھا اور بڑھتی مشق کے ساتھ وہ سمندر کے کنارے کچھ دور تک تیرتا ہوا جانے لگا۔ جب تھک جاتا تو وہ کھانستا اور خراٹے لیتا ہوا پلٹتا اور رینگتا ہوا ساحل پر جا کر ریت میں لوٹ لگاتا۔ آخر کار ایک دن یہ حقیقت اُس پر کھل گئی کہ میں فی الواقع پانی کا رہنے والا ہوں۔ اس کیفیت سے آگاہ ہونے پر اُسے جو خوشی ہوئی اندازہ سے باہر ہے۔ دن رات وہ سمندر میں پڑا رہا کرتا اور اپنے نوعمر دوستوں کے ساتھ موجوں میں تیرتا اور غوطہ لگاتا ہوا رنگ رلیاں مناتا۔ کبھی وہ پایاب پانی میں دُم کے بل کھڑے ہو کر بڑے دریائی بچھڑوں کی طرح سر کو کھجاتا اور کبھی چکنی اور سلیٹ چٹانوں پر جو پانی کی سطح سے اوپر اُٹھی ہوئی تھیں چڑھ کر ناچتا اور کودتا۔

اکتوبر کے آخر میں دریائی بچھڑے جزیرۂ سینٹ پال سے رخصت ہونا شروع ہوئے اور تشینوں کے لیٔے جو لڑائی جھگڑا اُن میں ہوتا تھا اُس کا خاتمہ ہو گیا۔ مجرد بچھڑوں کی اب خوب بن آئی۔ سانڈوں اور اُن کے بال بچوں کے چلے جانے سے اب وہ ساحل کے مالک بن گئے جہاں چاہتے رہتے اور جہاں چاہتے کھیلتے۔ مشکو نے چلتی دفعہ کوٹک سے کہا یہ اگلے سال تم بھی مجرد ہو کر رہنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ لیکن اِس سال تمہیں ماہی گیری کا سبق سیکھنا چاہیئے

غرضکہ یہ سب کے سب بحرالکاہل کو قطع کرتے ہوئے روانہ ہوئے اور مشکو نے کوٹک کو سمندر میں پیٹھ کے بل پانی میں سے ناک باہر نکال کر سونے کا سبق پڑھایا۔ بحرالکاہل کی لہروں کے ہلکے فرحت بخش تموج سے بڑھ کر ایک ننھے دریائی بچھڑے کے لئے کوئی گہوارہ نہیں ہو سکتا اور جب کوٹک پر نیند کا غلبہ ہوتا تو وہ اس ڈھب سے جو اُس کی ماں نے اُسے سکھایا تھا اپنی پیٹھ کے بل پانی پر سو رہتا۔ ایک دن کوٹک کے تمام جسم میں یکایک ایک سنسناہٹ سی اُٹھی جب اُس نے اپنی ماں سے یہ کیفیت بیان کی تو اُس نے جواب دیا کہ بیٹا کچھ مدت میں تم خود بخود جاننے لگو گے کہ تمہیں کس سمت میں تیرنا چاہیئے۔ لیکن فی الحال جس طرف دریائی سوسمار جاتا ہے اُسی طرف ہم بھی جائیں گے کیونکہ وہ بڑا دانا ہے۔ دریائی سوسماروں کا ایک غول پانی کو نہایت سُرعت سے چیرتا ہوا جا رہا تھا کوٹک بھی اُس کے پیچھے ہو لیا۔ ایک سوسمار سے اُس نے ہانپ کر پوچھا کہ تم کو یہ بات کس طرح معلوم ہو گئی کہ اس طرف جانا چاہیئے۔ سوسمار نے جواب دیا کہ لڑکے میاں میری دُم جھنجھنا رہی ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ میرے پیچھے ایک طوفان آ رہا ہے۔ بھاگ کر آؤ۔ جب تم سیلے پانی (اِس سے اُس کی مراد خط استوا سے تھی) کے جنوب کی طرف ہو اور تمہاری دم میں سنسناہٹ پیدا ہو تو جان لو کہ تمہارے آگے طوفان ہے۔ اُس وقت تمہیں چاہیئے کہ فوراً شمال کا رُخ کرو۔ چلو جلدی چلو پانی کی حالت یہاں اچھی نہیں۔

یہ بات منجملہ اُن بہت سی باتوں کے تھی جو کوٹک نے اس زمانہ میں سیکھیں اور اُسکی معلومات

کا ذخیرہ روز بروز بڑھتا چلا۔ منکو نے کوٹک کو سکھایا کہ گہرے پانی میں کس طرح کاڈ مچھلی کا تعاقب کرنا چاہیئے۔ سمندر کی تہ پر پانی کی سطح سے کئی سو فیٹ نیچے جو ڈوبے ہوئے جہاز پڑے ہوں انکی جانچ پڑتال کس طرح کرنی چاہیئے اور مچھلیوں کی طرح اُس کے ایک دریچہ میں داخل ہوکر دوسرے میں سے بندوق کی گولی کی طرح کیوں کر نکل آنا چاہیئے۔ جب آسمان پر بجلی کوند رہی ہو تو موجوں کی چوٹی پر رقص کرکے بحری قاز اور بحری باز کے آگے جبکہ وہ ہوا کی رَو کے ساتھ اڑتے ہوئے جا رہے ہوں خوش خلاقی کے ساتھ کس طرح اپنے پروں کو پھڑپھڑانا چاہیئے اور ڈلفین کی طرح پروں کو بازو سے ملاکر اور دُم کو موڑ کر پانی کی سطح سے تین چار فیٹ بلند کس طرح کودنا چاہیئے۔ کوٹک نے اپنی ماں سے یہ بھی سیکھا کہ اُڑنے والی مچھلیوں کا شکار نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اُن میں سوائے کانٹوں کے اور کچھ نہیں ہوتا اور یہ ترکیب بھی اُسے معلوم ہوگئی کہ پانی کی سطح سے بیس گز نیچے جب کاڈ مچھلی بہ سرعت تمام جھپٹی ہوئی جا رہی ہو تو اُس کے بدن سے گوشت کا ایک لوتھڑا جھپٹا مار کر کس طرح نوچ لینا چاہیئے۔ اس کے علاوہ کوٹک کی ماں نے اُس کو متنبہ کر دیا کہ کبھی بھولے سے بھی رُک کر کسی کشتی یا جہاز اور علی الخصوص چپوؤں سے کھیئے جانے والی کشتی کا تماشا نہ دیکھنے لگے غرضکہ چھ مہینے کی مدت میں کوٹک کو ماہی گیری کے تمام راز معلوم ہوگئے اور اس زمانہ میں ایک دفعہ بھی وہ خشکی پر نہیں گیا۔

لیکن ایک دن جبکہ وہ جزیرہ جون فرنینڈز کے قریب گنگنے پانی میں آنکھیں آدھی کھولے اور آدھی بند کئے پڑا تھا اُسے محسوس ہوا کہ میں نہایت سست اور مضمحل ہو رہا ہوں اور اُس پر وہی کیفیت طاری ہوئی جو انسانوں پر موسم بہار کے شروع میں طاری ہوا کرتی ہے۔ اُس وقت اُسے تو اس تو شنہ کے جاں فزا اور اندوہ ربا ساحل کا خیال آیا جو وہاں سے سات ہزار میل کے فاصلہ پر تھا اور اُسکے دل میں اُن دنوں کی یاد تازہ ہوگئی جب وہ اپنے ہمجولیوں کے ساتھ لب ساحل کھیلا کرتا تھا۔ سمندر کی کائی کی خوشبو سونگھا کرتا تھا اور دریائی بچھڑوں کو جوش و خروش کے ساتھ لڑتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ اِس خیال کے آتے ہی اُس نے شمال کا رُخ کیا اور تیرتا ہوا چلا۔ رستہ میں اُسے اپنے بیسیوں

رفیق جو اس کی طرح نواس توشنہ کو جارہے تھے ملے۔ انہوں نے اُسے دیکھ کر کہا "بھائی کوٹک سلام! اس سال ہم سب کو مجرد بچھڑوں کا درجہ حاصل ہوگیا ہے اور اس لئے ہم توقمن کی موجوں کی تھپیڑوں میں آگ کے ناچ کی رسم ادا کرسکتے ہیں اور نئی اُگی ہوئی گھاس پر کھیل سکتے ہیں۔ مگر یہ پوستین تم کو کہاں سے ملا"؟

کوٹک کا پوستین اب برف کی طرح سفید تھا اور اگرچہ اسے اس پر بڑا ناز تھا لیکن وہ صرف اسی قدر بولا "جلد جلد تیرو۔ میرا جی خشکی پر جانے کے لئے بے قرار ہورہا ہے" غرضکہ اس طرح سے سفر کرتے ہوئے یہ سب کے سب اُس ساحل پر پہنچے جہاں وہ پیدا ہوئے تھے اور جہاں انہوں نے بڈھے سانڈوں کو جو اُن کے باپ تھے دھند اور کُہر میں لڑتے دیکھا تھا۔

اُسی رات کو کوٹک دوسرے یک سالہ دریائی بچھڑوں کے ساتھ آگ کا ناچ ناچا۔ گرمی کے دنوں میں راتوں کو سمندر نواس توشنہ سے لے کر توقمن تک آگ کا میدان بنا ہوا نظر آتا ہے۔ ہر ایک دریائی بچھڑا پانی کی لہر کو جلتے تیل کی طرح اپنے پیچھے چھوڑتا ہے اور جب وہ پانی کے اوپر زقند بھرتا ہے تو اُس کے ساتھ ہی آگ کا ایک شعلہ بلند ہوتا ہے۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے موجیں نورانی نظر آتی ہیں اور سمندر جگمگاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ غرضکہ کوٹک اور اُس کے رفیق آگ کا ناچ ناچنے کے بعد خشکی پر گئے اور وہاں خودرو جنگلی گیہوں کے کھیتوں میں لوٹ لگانے اور ایک دوسرے کو اپنے سمندر کے قیام کے زمانہ کی سرگذشت سنانے لگے۔ بحرالکاہل کا ذکر وہ آپس میں اُسی طرح سے کرتے تھے جس طرح کہ لڑکے جنگل کا حال بیان کیا کرتے ہیں جہاں وہ پھل پھلاری چننے کے لئے گئے ہوں۔ اور اگر کوئی اُن کی بولی سمجھ سکتا تو وہ بحرالکاہل کا ایک نہایت مکمل نقشہ تیار کرسکتا۔ تین چار سال کی عمر والے دریائی بچھڑے ہچنسن کی پہاڑی سے یہ پکارتے ہوئے اُترے "بچو رستہ چھوڑو۔ سمندر بہت گہرا ہے اور تمہیں ابھی تک اُس کی پوری کیفیت معلوم نہیں ہوئی۔ کچھ دنوں اور صبر کرو۔ اے یک سالہ بچے یہ سفید پوستین تجھے کہاں سے ملا"؟

کوٹک نے یہ سُن کر جواب دیا۔ کہ مجھے یہ پوستین کہیں سے ملا نہیں بلکہ میں پیدا ہی اس کو اپنے

جسم پر لپکر ہوا تھا۔ یہ کہہ کر وہ اپنے مخاطب کو ایک تھپڑ مار کر گرا یا ہی چاہتا تھا کہ ایک دیت کے ٹیلے کے پیچھے سے دو لال رنگ کے چپٹے چہرے والے آدمی جن کے بال کالے تھے نمودار ہوئے۔ کوٹنک نے جس نے اس سے پہلے کبھی کسی انسان کو نہیں دیکھا تھا کھنکار کر اپنا سر نیچے کر لیا۔ اور دوسرے بچھڑے کچھ دھاکر مبہوت نگاہوں سے اجنبیوں کو دیکھنے لگے۔ ان دونوں آدمیوں میں سے ایک تو اس جزیرہ کا دریائی بچھڑوں کا میر شکاری کیرک بوٹرن نامی تھا اور دوسرا اُس کا بیٹا تھا جس کا نام پٹالمن تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے گاؤں سے جو سمندر کے ساحل سے ایک میل کے فاصلہ پر واقع تھا آئے تھے اور یہ فیصلہ کر رہے تھے کہ کن کن بچھڑوں کو منبح کی طرف ہانک کر لے جانا چاہیئے۔ دریائی بچھڑوں کو بھی بھیڑوں کی طرح ہانکتے ہوئے لیجاتے ہیں اور اُنھیں مار کر اُن کی کھال فرغلوں اور لبادوں وغیرہ کے بنانے کے کام میں لائی جاتی ہے۔

اس وقت پٹالمن دفعتہً گبھرا کر پکارا "باوا دیکھو تمہارے سامنے ایک سفید دریائی بچھڑا کھڑا ہے"

کوٹنک کو دیکھ کر کیرک بوٹرن کا رنگ فق ہو گیا کچھ دیر تک وہ خوف زدہ ہو کر کھڑا رہا۔ آخر کار اُس نے اپنے بیٹے سے کہا "پٹالمن اس بچھڑے کو مت چھیڑنا۔ جب سے میں پیدا ہوا ہوں آج تک میں نے کوئی سفید دریائی بچھڑا نہیں دیکھا۔ شاید یہ بڈھے زداف کی روح ہے جو ایک دریائی بچھڑے کے قالب میں اس دنیا میں پھر آئی ہے۔ پار سال سمندر میں ایک بڑا طوفان آیا تھا اور زداف اُس میں ڈوب گیا تھا"

پٹالمن بولا "میں اس کے نزدیک نہیں جاتا۔ اس کا چھونا گویا آفت کا مول لینا ہے۔ مگر باوا جان کیا آپکے خیال میں یہ فی الحقیقت بڈھا زداف ہے جو اس دنیا میں واپس آیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو میری خیر نہیں کیونکہ مجھے کچھ بحری قاز کے انڈے اُسے دینے آتے ہیں"

کیرک نے جواب دیا "تو اُس کی طرف تم دیکھو ہی مت۔ چار سالہ بچھڑوں کے اُس سامنے والے گروہ کو تم ہانکتے ہوئے لے چلو۔ ہمارے آدمیوں کو آج دو سو بچھڑوں کی کھال کھینچ لینی چاہیئے

مگر موسم کی ابھی ابتدا ہے اور یہ کام اُن کے لئے لینا ہے۔ اس لئے آج صرف ایک سو بچھڑوں کی تعداد کفایت کرے گی۔ دیکھو جلدی کرو۔"

پٹالمن نے مجرو بچھڑوں کے ایک گلہ کے قریب جاکر دو ہڈیاں آپس میں کرکر کرکے بجائیں جس کی آواز سنتے ہی بچھڑے خوف زدہ ہو کر افتاں و خیزاں آگے بڑھے۔ کیرک نے اُنہیں جزیرہ کے وسط کی طرف ہانکنا شروع کیا اور اُنہوں نے ایک دفعہ بھی کوشش نہیں کی کہ اپنے رفیقوں سے جا ملیں۔ ہزاروں لاکھوں دریائی بچھڑے دیکھ رہے تھے کہ اُن کے ساتھیوں کو لوگ ہانکتے ہوئے لئے جا رہے ہیں لیکن کسی نے اس کی ذرا بھی پروانہ کی۔ بلکہ بدستور اپنے کھیل تماشے میں مصروف رہے۔ البتہ کوٹک نے اُن سے یہ سوال کیا کہ ہمارے ساتھیوں کو کہاں لئے جا رہے ہیں اس کا جواب دوسرے بچھڑے سوائے اس کے اور کچھ نہ دے سکے کہ انسانوں کا قاعدہ ہے کہ ہر سال چھ مہینے میں سے دو مہینے تک وہ اسی طرح دریائی بچھڑوں کو ہانک کر لے جایا کرتے ہیں۔ یہ سُن کر کوٹک نے کہا کہ میں بھی اپنے ساتھیوں کے پیچھے پیچھے جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ اُنہیں کیا پیش آتا ہے۔ اور یہ کہتے ہی وہ گلّہ کے پیچھے بہ سُرعت تمام روانہ ہوا۔

پٹالمن نے جب کوٹک کو آتے ہوئے دیکھا تو اُس نے چلا کر اپنے باپ سے کہا "ایلو! سفید بچھڑا ہمارے پیچھے پیچھے آرہا ہے اور یہ پہلی ہی مرتبہ ہے کہ ایک دریائی بچھڑا مذبح کی طرف آپ سے آپ چلا آیا ہے۔"

کیرک نے جواب دیا "خاموش۔ پیچھے مڑ کر مت دیکھو۔ مجھے اب یقین ہو گیا کہ یہ سنرورزراف کی روح ہے۔ میں فارپادری سے اسکے متعلق گفتگو کرونگا۔"

مذبح کا فاصلہ ریتیلے ساحل سے صرف نصف میل تھا لیکن اس کے طے کرنے میں ایک گھنٹہ لگا کیونکہ اگر دریائی بچھڑے زیادہ تیزی کے ساتھ جاتے تو کیرک جانتا تھا کہ وہ گرما جائینگے جس کی وجہ سے کھال کھینچے جانے کے وقت اُن کے سمور کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اتر جائینگے اس لئے وہ نہایت آہستہ آہستہ شیر دریائی کے مسکن کو طے کرتے ہوئے ایک گھنٹہ کے

بعد منزل مقصود پر جو اُن کے لئے موت کا گھر تھی پہنچے۔ کوٹک بھی ہانپتا ہوا اور تعجب کرتا ہوا اُن کے ساتھ ساتھ گیا۔ خشکی پر اتنی دور اس سے پہلے اُسے چلنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا اُس نے یہی سمجھا کہ میں دنیا کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا ہوں۔ مگر دریائی بچھڑوں کے نشیمنوں سے جو لب ساحل واقع تھے ابھی تک شور و غل کی آواز ایسی ہی گونج کے ساتھ آ رہی تھی جیسی کہ کسی سُرنگ میں ریل کی آتی ہے اس وقت کیرک زمین پر بیٹھ گیا اور اپنی جیب میں سے ایک بھدی سی گھڑی نکال کر وقت دیکھنے لگا۔ دریائی بچھڑوں کے گلہ کو اُس نے تیس منٹ تک دم لیکر ٹھنڈا ہونے دیا۔ کوٹک اُس سے اِس قدر قریب تھا کہ اُس کی ٹوپی کے چھجے پر سے شبنم کے جو قطرے ٹپ ٹپ نیچے گر رہے تھے اُن کی آواز اُسے سُنائی دے رہی تھی۔ جب آدھا گھنٹہ گذر چکا تو دس یا بارہ آدمی جن میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں لوہے کا تین چار فیٹ لمبا گُرز تھا آگے بڑھے اور کیرک کے اشارہ پر اُنہوں نے دو چار دریائی بچھڑوں کو جن کے جسم پر اپنے ساتھیوں کے کاٹنے کے نشان پڑے ہوئے تھے یا جو ابھی زیادہ گرم تھے اپنے بوٹوں کی ٹھوکریں مار مار کر دوسرے بچھڑوں سے علیحدہ کر دیا کہ اسکے بعد کرک نے بآواز بلند کہا چلو یہ سنتے ہی آدمیوں نے اپنے گُرز تڑا تڑ دریائی بچھڑوں کے سروں پر برسانے شروع کئے۔ دس منٹ کے بعد کوٹک اپنے رفیقوں میں سے ایک کی شکل بھی نہیں پہچان سکا کیونکہ اُن کی کھالیں ناک سے لیکر پچھلے پنجوں تک کھینچ لی گئی تھیں اور زمین پر اُن کے ڈھیر لگا دئے گئے تھے بیچارے کوٹک کے لئے یہ نظارہ بس تھا۔ وہ دفعتہً پلٹا اور بے تحاشا سمندر کی طرف بھاگا۔ (دریائی بچھڑا کچھ دور تک بہت تیز دوڑ سکتا ہے) مارے خوف کے اُس کے جسم کا ہر ایک رونگٹا کھڑا ہو رہا تھا۔ شیر دریائی کے مسکن کے قریب جہاں بڑے بڑے دریائی شیر مینڈ پر بیٹھا کرتے ہیں وہ غڑاپ سے ٹھنڈے پانی میں جا کودا اور ہانپنے لگا۔ ایک دریائی شیر نے جو پاس ہی تھا غرّا کر پوچھا "دور کیا ہے"؟ دریائی شیر عام طور پر علیحدہ ہی رہتے ہیں اور بچھڑوں سے میل ملاپ نہیں رکھتے۔

کوٹنگ نے بیقراری کے عالم میں جواب دیا "مجھے نہایت صدمہ پہنچا ہے۔ میرا دل نہایت بیقرار ہے۔ سمندر کے ساحل پر جس قدر بھی بچھڑے تھے وہ اُن سب کو مار رہے ہیں"

دریائی شیر نے ساحل کی طرف مُنہ پھیر کر جواب دیا "یہ تمہاری بیتابی میری سمجھ میں نہیں آئی تمہارے سب دوست ساحل پر پہلے کی طرح کھیل کود اور سیر و تماشے میں مشغول رہیں اور اُن کا شور و غل ذرا فرو نہیں ہوا۔ تم نے غالباً بچے بکریک کو کسی گلہ کا صفایا کرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ مگر اس میں نئی بات کونسی ہے وہ تیئیس سال سے برابر اس کام کو کر رہا ہے"

اس پر کوٹنگ نے کہا "میں تو اس بات کی تاب نہیں لا سکتا۔ یہ ایک نہایت ہی خوفناک بات ہے"

دریائی شیر بولا "تمہیں یہ بات ہیبت ناک معلوم ہوتی ہو۔ لیکن اگر تمہاری قوم ہر سال اس ساحل پر آیا کرے گی تو لامحالہ انسانوں کو معلوم ہو جائیگا۔ اور وہ ہمیشہ تمہارا شکار کیا کرینگے۔ ہاں اگر تم کو کوئی ایسا جزیرہ ملجائے جہاں انسانوں کا قدم نہ پہنچا ہو تو تمہیں اطمینان اور سلامتی سے زندگی بسر کرنے کی امید ہو سکتی ہے"

کوٹنگ نے پوچھا "کیا دنیا میں ایسا کوئی جزیرہ نہیں ہے"

دریائی شیر نے جواب دیا "میں بیس سال تک ہلبوس مچھلی کے پیچھے اس امید میں پھرتا رہا ہوں کہ وہ اس قسم کے کسی جزیرہ میں جائے تو مجھے بھی اُس کا سراغ ملجائے لیکن آج تک مجھکو کامیابی نہیں ہوئی۔ مگر چونکہ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں اپنے بڑوں سے بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے کا بہت شوق ہے اس لئے تم دریائی سانڈ کے جزیرہ میں جاؤ اور وہاں سمندر جادو سے ملو۔ غالباً وہ تمہارے سوال کا جواب دے سکے گا۔ یہاں سے وہ جزیرہ چھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ لیکن تم تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو اور اگر میں تمہاری جگہہ ہوتا تو پہلے پانی سے نکل کر کچھ دیر سستا کر لیتا"

کوٹنگ نے اِس نصیحت پر عمل کیا اور اپنے ساحل کی طرف تیرتا ہوا بڑھا وہاں پہنچکر وہ پانی سے

نکلا اور ریت میں آدہ گھنٹہ کے لئے پڑ کر سو گیا۔ سوتے وقت اُس کا تمام جسم پھڑ پھڑا رہا تھا جیسا کہ دریائی بچھڑوں کا سونے کی حالت میں قاعدہ ہوتا ہے۔ نیند سے چکنے کے بعد کوٹک نے سیدھا دریائی سانڈ کے جزیرہ کا رُخ کیا۔ یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ تہا جو نواس توشنہ کے شمال مشرق کی طرف واقع تہا۔ اس جزیرہ میں پہاڑیاں اور چٹانیں جا بجا پہیلی ہوئی تہیں جن پر بحری قازوں نے اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے اور دریائی سانڈوں کے گلّے اُسیں رہا کرتے تہے۔

جزیرہ کے کنارہ پر وہ اُس جگہہ جا نکلا جہاں سمندر جادو اپنے پچھلے پاؤں آدہے جہال میں اور آدہے اُس سے باہر نکالے ہوئے لیٹا ہوا تھا۔ سمندر جادو بحر الکاہل شمالی کا دیو قامت کریہ المنظر۔ پیپے کی طرح پھولا ہوا۔ دودڑوں سے بھری ہوئی کھال۔ موٹی گردن اور لمبے دانتوں والا دریائی سانڈ تھا جو سونے کی حالت کے سوا اور کسی حالت میں یہ نہ جانتا تہا کہ تمیز کس جانور کا نام ہے۔ اس وقت بہی وہ سو رہا تھا۔

بحری قاز بہت شور مچا رہے تہے اس لئے کوٹک نے جس قدر بلند آواز سے اُس سے ہو سکا چلا کر کہا "سمندر جادو! سمندر جادو ہوت! جاگو!

سمندر جادو نے ایک جمائی لی۔ اور گھبرا کر کہا "کون ہے ہے مجھے کس نے پکارا ہے" اور یہ کہہ کر اُس نے اپنے دانت کی ضرب سے دوسرے سانڈ کو جو اُسکے پیچھے سو رہا تھا جگایا اور اس دوسرے نے اسی طرح سے اپنے پیچھے والے سانڈ کو جگا دیا اور علیٰ ہذا القیاس باقی کے سانڈ بہی سلسلہ وار جاگتے ہوئے چلے گئے حتیٰ کہ تہوڑی دیر میں تمام سانڈ جاگ اُٹھے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف دیکھنے لگے مگر جس طرف دیکھنا چاہیئے تھا اُس طرف کوئی نہیں دیکھتا تہا۔

آخر کار کوٹک نے جو ایک سفید گھونگا معلوم ہو رہا تھا کہا "ادہر دیکھو میں ہوں کوٹک"۔

سمندر جادو نے قہر آلود نگاہ سے کوٹک کی طرف دیکھا اور دوسرے دریائی سانڈوں نے بہی اُسپر اس طرح کی نظر ڈالی جیسے افیمی بڈہے اُس لڑکے پر ڈالا کرتے ہیں جو اُن کے مجمع میں آکر اُن کو دق کرے۔ کوٹک نے اُن کی اس خفگی کے اظہار کی ذرا پروا نہ کی اور بولا "کیا تم مجھے کوئی ایسی جگہہ بتا

سکتے ہو جہاں دریائی بچھڑے جاکر رہیں مگر جہاں آدمی کبھی نہ آتے ہوں۔"

سمندر جادو نے دانت پیس کر جواب دیا "جا کے دریافت کرتا پھر۔ بھاگ جا یہاں سے ہم اپنے کام میں مصروف ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور بہر مینک میں چلا گیا کوٹک ڈلفین کی طرح ہوا میں اُچھلا اور بہ آواز بلند چلّایا: "گھونگے کھانے والا۔ کائی پر اوقات بسر کرنے والا۔" اُسے معلوم تھا کہ سمندر جادو گو بظاہر خوفناک ہوتا تھا لیکن اُس نے عمر بھر مچھلی کا شکار نہیں کیا تھا بلکہ گھونگے اور سمندر کی کائی نکال نکال کر کھاتا تھا۔ بحری پنڈبیوں اور بحری قازوں نے جو ہمیشہ اِس بات کی تاک میں لگے رہتے تھے کہ موقعہ پائیں تو سمندر جادو پر جو کریہ المنظر ہونے کے علاوہ نہایت ہی کج خُلق تھا آوازہ کسیں کوٹک کے فقرہ کو دُہرانا شروع کیا اور مسٹر شن مجھ سے کہتا تھا کہ دریائی سانڈوں کے جزیرہ پر اِسوقت پانچ منٹ تک ایسا شور و غل برپا رہا کہ بندوق بھی اگر چلتی تو آواز نہ آتی۔ سب کے سب آبی پرندے چیختے اور چلّاتے ہوئے یہ شور مچا رہے تھے "کائی کھانے والا! گھونگے ڈھکوسنے والا بڈھا کھوسٹ!" سمندر جادو اپنی شان میں ایسے حقارت آمیز لفظ سُن سُن کر پیچ و تاب کھا رہا تھا اور غرّاتا اور کھنکارتا ہوا کروٹیں بدل رہا تھا۔

اس وقت کوٹک نے ہانپ کر کہا "اب بھی بتاؤ گے یا نہیں؟"

سمندر جادو نے جواب دیا "جاکر دریائی بیل سے دریافت کر۔ اگر وہ زندہ ہے تو جو بات تو نے پوچھی ہے وہ تجھے بتا سکے گا۔"

کوٹک نے پوچھا "دریائی بیل کی شکل کیسی ہے۔ میں اگر اُس سے ملوں تو کس طرح پہچانوں کہ دریائی بیل یہی ہے؟"

اِس پر ایک بحری فاز نے سمندر جادو کے سر کے گرد چکر کاٹ کر کہا "دریائی بیل کا پتہ یہ ہے کہ سمندر جادو سے بھی زیادہ بدشکل ہے اور بدشکل ہی نہیں بلکہ بداخلاق میں بھی وہ اس سے بڑھا ہوا ہے۔ کائی کھانے والا! گھونگے ڈھکوسنے والا! بڈھا کھوسٹ!"

کوٹک اب رخصت ہوا اور تیرتا ہوا نواسس توشنہ پہنچا لیکن وہاں اُسے معلوم ہوا کہ

کسی کو اُس کی اس تجویز سے کہ دریائی بچھڑوں کی قوم کے لئے کوئی ایسی جگہ تلاش کی جائے جہاں وہ امن وفارغ البالی کے ساتھ زندگی بسر کریں اتفاق نہ تھا۔ اُس کے رفیقوں نے اُس سے کہا کہ آدمی ہمیشہ سے مجرد بچھڑوں کو ہانک کر لیجاتے رہے ہیں اس میں کوئی نئی بات نہیں اور اگر تمہیں ڈرانے والے تماشے کے دیکھنے کی خواہش نہ تھی تو تم مذبح میں گئے ہی کیوں تھے؟ لیکن دوسرے کسی دریائی بچھڑے نے اپنے ساتھیوں کو قتل ہوتا ہوا نہیں دیکھا تھا اور کوٹک میں اور دوسرے بچھڑوں میں یہی فرق تھا۔ اِس کے علاوہ اگر کوئی اور فرق اُن میں اور کوٹک میں تھا تو وہ یہ کہ کوٹک کی رنگت سفید تھی۔

بحری صیاد نے جب اپنے بیٹے کی سرگذشت سُنی تو کہا "بیٹا تمہیں چاہیے کہ نشو ونما پاکر تن وتوش اور زور و طاقت میں اپنے باپ کے برابر ہو جاؤ اور شادی کرکے اپنے اور اپنے بال بچوں کے لئے ساحل پر ایک نشیمن تجویز کرلو۔ پھر تم سے کوئی تعرض نہیں کریگا۔ پانچ سال میں تم اس قابل ہو جاؤ گے کہ اپنے دشمنوں کا مقابلہ خود کر سکو" نیک نہاد متکو نے بھی جو اُس کی ماں تھی اُس سے یہ کہا "کوٹک تم مجرد بچھڑوں کو مارے جانے سے کبھی بچا نہیں سکو گے۔ جاؤ جاکر دریا میں کھیلو" غرضکہ کوٹک گیا اور سمندر میں آگ کا ناچ ناچا مگر اُس کا دل پامال اندوہ وغم تھا۔

جب بہار کا موسم گذر گیا اور خزاں آئی تو کوٹک اپنے دل میں ایک بات ٹھان کر تن تنہا نواس توشنہ سے رخصت ہوا۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ دریائی بیل سے جاکر ملے اور یہ دریافت کرے کہ آیا کوئی ایسا جزیرہ بھی روئے زمین پر موجود ہے جس کے وسیع اور فرحت بخش ساحلوں پر دریائی بچھڑے جاکر آرام و اطمینان سے رہ سکیں اور وہاں آدمی اُن سے تعرض نہ کر سکیں۔ غرضکہ اُس نے تمام بحر الکاہل کو شمال سے لیکر جنوب تک اس جستجو میں ایک دن میں تین تین سو میل تیر کر چھان مارا۔ اثنائے سفر میں اُسے بہت سے حادثے پیش آئے جن کی تفصیل کے لئے ایک کتاب چاہیئے۔ ایک دفعہ وہ ایک گھڑیال کے مُنہ میں جاتے جاتے بچا۔ اور سمندر میں جتنے ڈاکو اور اُچکے بدمعاش موج نوردی کیا کرتے ہیں سب سے اُس کی مڈ بھیڑ ہوئی۔ لیکن جس مقصد کے لئے

اُس نے سفر اختیار کیا تھا وہ حاصل نہوا۔ نہ تو اُسے دریائی بیل ہی ملا اور نہ کوئی ایسا جزیرہ جو اُسکی مرضی کے مطابق ہو۔ اگر کسی جزیرہ کے ساحل کو وہ حسب دلخواہ پاتا تو ساتھ ہی کچھہ دور پر کسی دُخانی کشتی کا دہواں بھی افق پر اُٹھتا ہوا اُس کے دیکھنے میں آتا اور اس دہوئیں کے معنی سے کونک بخوبی واقف تھا۔ یا وہ دیکھتا کہ دریائی بچھڑے یہاں ایک دفعہ آئے تو تھے مگر انجام یہاں بھی اُن کا وہی ہوا جو نو اس تو شنہ میں ہوا کرتا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکال لیتا کہ جہاں آدمیوں کا گذر ایک دفعہ ہوا ہو۔ وہاں وہ پھر بھی آسکتے ہیں۔

ایک دفعہ کونک نے ایک بڈہے بحری ہنس کے ساتھ دوستی گانٹھی جس نے اُسے یہ بتایا کہ امن و اطمینان سے زندگی بسر کرنے کے لیے جزیرہ کرگولن سے بڑہ کر کوئی جگہہ نہیں۔ یہ اطلاع پاکر کونک اس جزیرہ کو دیکھنے گیا اور جب اُس کے ساحل کے قریب پہنچا تو بمشکل تمام ایک طوفان میں کچھہ کالی چٹانوں سے جو پانی میں اُٹھی ہوئی تھیں ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ لیکن جب طوفان ذرا تھما تو اُس نے دیکھا کہ اس جزیرہ میں بھی دریائی بچھڑوں کے نشیمن موجود تھے اور جن جن جزیروں میں وہ گیا وہاں بھی اُس نے یہی حال پایا۔

لمرشن نے مجھے بہت سے جزیروں کے نام بتائے جہاں جہاں کونک گیا تھا اور بیان کیا کہ کونک پانچ سال تک اس جستجو میں سفر کرتا رہا۔ ہر سال میں چار مہینے تو وہ البتہ نو اس تو شنہ میں آرام لیتا اور اس زمانہ میں دوسرے مجرد بچھڑے اُس کا اور اُس کے خیالی جزیرہ کا مضحکہ اوڑایا کرتے لیکن باقی زمانہ وہ سفر میں گذارتا تھا۔ پہلے وہ جزیرہ گیلاپگاس میں گیا جو خط استوا کے قریب ایک نہایت ہی گرم اور خراب مقام ہے اور جہاں مارے گرمی کے اُس کی ایسی بُری حالت ہوئی کہ وہ مرتے مرتے بچا۔ اس کے بعد وہ یکے بعد دیگرے مجمع الجزائر۔ جارجیا۔ جزیرہ آرکنیز۔ جزیرہ زمرد۔ جزیرہ بلبل۔ جزیرہ گاف۔ جزیرہ بورٹ۔ اور جزیرہ کروسٹس میں گیا۔ حتیٰ کہ ایک چھوٹا سا جزیرہ بھی جو اس امید کے جنوب کی جانب واقع تھا۔ اُس کی جزیرہ گردی سے نہیں بچا لیکن ہر جگہہ سمندر والے اُسے وہی پُرانی داستان

سناتے جسے سنتے سنتے وہ مایوس ہو چلا تھا۔ اُس سے یہی بیان کیا جاتا تھا کہ دریائی بچھڑے اس جزیرہ پر ایک زمانہ میں آکر رہے تھے لیکن آدمی زادوں نے اُن سب کو مار ڈالا۔ اور یہ حالت کچھ بحرالکاہل کے جزیروں پر ہی موقوف نہ تھی بلکہ ایک دفعہ جب وہ ایک دوسرے سمندر میں بحرالکاہل سے کئی ہزار میل کے فاصلہ پہ پہنچا اور اُس کا گذر ایک مقام میں جو راس کا ئیٹ ہیرنیز کہلاتا تھا ہوا تو اُس نے ایک چٹان پر کئی سو دریائی بچھڑوں کو دیکھا اور اُنہوں نے اس سے کہا کہ یہاں بھی آدمی زاد آیا کرتے ہیں۔ یہ سُن کر بیچارے کوٹک کا دل قریب قریب ٹوٹ گیا۔ اس نے دل میں خیال کیا کہ اب زیادہ سفر کرنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ یہ سوچ کر اُس نے نواس تو شنہ کے ساحل کا رُخ کیا۔ ایک دن تیرتے تیرتے وہ ایک جزیرہ میں پہنچا جو سبز درختوں سے بھرا تھا۔ یہاں اُس نے سمندر کے کنارے ایک ضعیف و ناتوان دریائی بچھڑے کو دیکھا جس کا آخری وقت قریب آپہنچا تھا۔ کوٹک نے کچھ مچھلیاں پکڑیں اور اُسے لاکر کھلائیں اور جب اُس میں کچھ سکت آئی تو اپنی تمام ناکامیوں کا حال اُس سے بیان کر کے اُس نے کہا "اب میں نواس تو شنہ کو واپس جاتا ہوں اور اگر دوسرے مجرد بچھڑوں کے ساتھ مجھے بھی آدمی زاد ہانک کر مقتل میں لیگئے تو مجھے چنداں پروا نہ ہوگی کیونکہ میری امیدوں کا اب خاتمہ ہو گیا ہے۔"

بڈھے دریائی بچھڑے نے جواب دیا "ایک دفعہ اور کوشش کر کے دیکھو میں مسافورا کے ساحل کا سب سے آخری بچھڑا ہوں۔ جس زمانہ میں انسان ہمارے ساحل پر آکر ہماری اَن گنت جماعت میں سے لاکھ لاکھ کو پکڑ کر مارا کرتے تھے تو ساحل پر ایک روایت مشہور تھی کہ شمال کی طرف سے کسی دن ایک سفید دریائی بچھڑا آئیگا اور اپنی قوم کو ایک ایسی جگہ لیجائیگا جہاں وہ امن اور فراغت کے ساتھ اپنے دن گذاریں گے۔ میں تو بڈھا ہوں اور قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں اس لئے میری قسمت میں نہیں کہ وہ دن دیکھوں لیکن دوسروں کے لئے وہ دن ضرور آئے گا۔ تم ایک دفعہ اور کوشش کرو۔"

کوٹک نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیکر کہا "سمندر کے کنارے اگر کوئی سفید دریائی بچھڑا کبھی

پیدا ہوا ہے تو وہ میں ہی ہوں۔ اور اگر کسی دریائی بچھڑے کو کبھی نئے جزیروں کی تحقیق کا خیال پیدا ہوا ہے۔ تو وہ بھی میں ہی ہوں۔"

غرضکہ کوٹک کی ہمت یہ بات سن کر بہت کچھ بڑھ گئی۔ جب موسم بہار کے شروع ہونے پر وہ نو اسس توشنہ میں پہنچا تو اُس کی ماں مٹکو نے اُس سے کہا کہ بیٹا اب تم کو چاہیئے کہ شادی کر کے اپنا گھر آباد کرو اور فراغت و اطمینان سے ایک جگہ رہنا شروع کرو کیونکہ اب تمہارا قد اپنے باپ بحری صیاد کے برابر ہو گیا ہے اور تم بھی ویسے ہی زبردست اور خونخوار نظر آتے ہو۔ یہ سن کر کوٹک نے جواب دیا۔" اماں جان مجھے ایک سال کی مہلت اور دیجیے۔ یاد رکھیئے کہ ساحل پر سب سے زیادہ دور تک جو لہر جایا کرتی ہے وہ ہمیشہ ساتویں موج ہوا کرتی ہے۔

عجیب اتفاق یہ ہوا کہ ایک بچھڑی نے بھی یہی خیال ظاہر کیا کہ میں اگلے سال چل کر شادی کرونگی۔ اس بچھڑی سے کوٹک کی نسبت ٹھہر گئی اور کوٹک اپنی آخری تحقیقات کی مہم پر روانہ ہونے سے ایک رات پہلے ساحل لوقنن پر اُس کے ساتھ ملکر آگ کا ناچ ناچا۔ اس مرتبہ اُس نے مغرب کا رُخ کیا کیونکہ اُسے ہلی بٹ مچھلیوں کے ایک بڑے غول کا کھوج ملگیا تھا اور اُسے اپنا پیٹ بھرنے کے لیے روزانہ کم از کم سوا من مچھلی کے گوشت کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس غول کا تعاقب کرتے کرتے وہ تھک گیا اور تابنے کے جزیرے کے قریب پانی میں پڑکر سو گیا۔ آدھی رات کے قریب یکایک اُس کی آنکھ کھلی اور اُس نے دیکھا کہ سمندر کے کنارے پایاب پانی میں کچھ عظیم الجثہ جانور کائی چرتے ہوئے پھر رہے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی وہ بولا۔" قسم ہے مجھکو میگیلن کی کوہ پیکر موجوں کی کہ میں نے اس سے پہلے سمندر کی اس قوم کے لوگوں کو نہیں دیکھا تھا۔"

ان جانوروں کی شکل سمندر کے کسی جانور سے جو کوٹک کے دیکھنے میں آچکا تھا نہیں ملتی تھی۔ نہ وہ دریائی گھوڑے کی طرح تھے نہ شیر دریائی کی طرح اور نہ دریائی بچھڑے۔ یا وہیل مچھلی یا گھڑیال یا کسی دوسرے اسی قسم کے جانور سے مشابہت رکھتے تھے۔ اُن میں سے ہر ایک

کا طول بین ۲ اور تین ۳ فٹ کے درمیان تھا اور دریائی بچھڑوں کی طرح اُن کے پچھلے پرنما پاؤں موجود نہیں تھے البتہ اُن کی کرچھے کی سی دُمیں تھیں جو ایسی معلوم ہوتی تھیں کہ گویا گیلے چمڑے کے ٹکڑے ہیں جو کاٹ کر اُن کی دُموں کی جگہہ لگا دئے گئے ہیں۔ اُن کے سروں کی شکل نہایت مکروہ اور لغو تھی اور چرائی کے وقت کے علاوہ وہ اپنی دُموں کے سہارے گہرے پانی میں کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو جھک کر سلام کرتے تھے اور اپنے اگلے چپو کے سے پنجوں کو اُسی طرح ہلاتے تھے جیسے کہ موٹا آدمی اپنا بازو ہلاتا ہو۔

کوٹک کھنکار کر بولا "صاحبو میں آپ کی خدمت میں تسلیم عرض کرتا ہوں" اس کے جواب میں عظیم الجثہ جانوروں نے اپنی گردن جھکائی اور اگلے پنجے ہلائے۔ جب اُنہوں نے پھر چرنا شروع کیا تو کوٹک نے دیکھا کہ اُن کے اوپر کے ہونٹ دو حصوں میں کٹے ہوئے ہیں اور کائی کا ہر لقمہ جو بتیس ۳۲ سیر سے کم نہ ہو گا منہ میں لیجاتے وقت وہ ان حصوں کو ایک دوسرے سے ایک فٹ کے فاصلہ سے جدا کر کے پھر ملا دیتے ہیں۔ کوٹک کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا اور وہ بولا کہ یہ بھی کھانے کا ایک عجیب طریقہ ہے اسوقت اُنہوں نے اپنی گردنیں پھر جھکائیں اور کوٹک کو اشتعال طبع ہونے لگا۔ برہم ہو کر اُس نے کہا "اگر تمہارے اگلے پنجوں میں ایک زائد جوڑ ہے تو تمہیں اُس کی نمایش کی چنداں ضرورت نہیں۔ میں دیکھ سکتا ہوں کہ تم خوبصورتی سے اپنے سروں کو خم کرتے ہو لیکن مجھے اپنا نام تو بتاؤ" اس کے جواب میں کٹے ہوئے ہونٹ پھر ملے اور ہری ہری شیشہ کی سی چمکدار آنکھیں پھر کوٹک پر جم گئیں لیکن مُنہ سے یہ عجیب جانور کچھ نہ بولے۔

تب تو کوٹک کو نہایت غصہ آیا اور وہ بولا "سمندر جادو سے زیادہ بدشکل اور زیادہ کج خلق میں نے اگر کسی کو پایا ہے تو تمہیں کو"

اُس وقت کوٹک کو دفعتہً وہ بات یاد آگئی جو بحری قاز نے دریائی گھوڑوں کے جزیرے میں اُس سے چلا کر اُسوقت کہی تھی جبکہ وہ ایک سال کا بچہ تھا۔ اس خیال کے ذہن میں آتے

وہ خوشی کے مارے پانی میں اُچھل پڑا کیونکہ اُسے معلوم ہوگیا کہ آخر کار دریائی بیل اُس کو مل گیا۔
دریائی بیل پھر چرنے لگے اور کوٹک نے ہر ایک زبان میں جو اُس نے اپنے کثیر التعداد سفروں میں سیکھی تھی اُن سے سوال پوچھنے شروع کئے لیکن دریائی بیلوں نے کچھ جواب نہ دیا جس کی وجہ یہ تھی کہ دریائی بیل بول نہیں سکتا۔ اُس کی گردن میں جہاں سات ہڈیاں ہونی چاہئیں وہاں صرف چھ ہیں اور سمندر والوں کی رائے ہے کہ اسی وجہ سے دریائی بیل اپنے ساتھیوں سے بھی بات چیت نہیں کرسکتا۔ مگر چونکہ اُس کے اگلے پنجے میں ایک زائد جوڑ ہے اس لئے وہ اُسکو نیچے اوپر ہلا کر اشاروں سے باتیں کرسکتا ہے۔
جب دن نکلا تو دریائی بیلوں نے نہایت دھیمی رفتار سے شمال کی طرف سفر کرنا شروع کیا۔ کوٹک بھی دل میں یہ کہتا ہوا اُن کے پیچھے پیچھے ہولیا" یہ اس قدر احمق اور نادان ہیں کہ اگر ان کو کوئی ایسا جزیرہ نہ مل گیا ہوتا جہاں انسانوں کی رسائی نہیں تو ان کا کبھی کا خاتمہ ہوچکا ہوتا۔ اور جو مقام سکونت دریائی بیل کے لئے عمدہ ہے وہ بحری صیاد کی اولاد کے لئے بھی موزوں ہونا چاہئے۔ بہرحال میں چاہتا ہوں کہ رستہ جلد جلد کٹے"
دریائی بیلوں کی سست چال نے کوٹک کو تھکا دیا۔ چالیس پچاس میل روزانہ سے زیادہ سفر وہ نہیں کرتے تھے اور رات کے وقت چرائی کے لئے ساحل پر اُتر پڑتے تھے۔ کوٹک نے ہزار چاہا کہ وہ ذرا تیز چلیں مگر اُنہوں نے اپنی رفتار ایک میل بھی نہیں بڑہائی۔ شمال کی طرف اس رفتار سے جاتے جاتے ایک دن کوٹک کو محسوس ہوا کہ وہ پانی کی ایک گرم رَو کے ساتھ تیر رہے ہیں اور اس وقت سے کوٹک اُن کو زیادہ وقعت کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ ایک دن رات کے وقت اُنہوں نے پانی میں جو چاندنی میں چمک رہا تھا غوطہ لگایا اور کوٹک نے دیکھا کہ اُنہوں نے تیزی سے تیرنا شروع کردیا ہے۔ وہ اُن کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ اور اُن کی اُس وقت کی سرعت رفتار پر اُسے نہایت ہی تعجب ہوا کیونکہ اُسے کبھی گمان نہیں ہوسکتا تھا کہ دریائی بیل کو بھی تیراک ہونے کا دعوٰی ہوگا۔ ساحل سے شروع ہوکر پہاڑیوں کا ایک سلسلہ دُور تک سمندر

میں چلا گیا تھا۔ دریائی بیل اِن پہاڑیوں کے متوازی تیرتے ہوئے گئے اور ان کے اختتام پر ایک تاریک سوراخ میں پانی کی سطح سے چالیس گز نیچے داخل ہوئے۔ کوٹک نے اپنے آپ کو ایک تاریک سرنگ میں پایا اور بہت دیر تک اُس سُرنگ میں اُسے ان کے پیچھے پیچھے جانا پڑا۔ تازہ ہوا اُس میں نام کو نہ تھی اور کوٹک کا دم گھٹا جا رہا تھا۔

آخر کار کوٹک سرنگ کے دوسرے سرے پر کھُلے پانی میں ہانپتا ہوا نکلا۔ دریائی بیل یہاں پہنچکر مُنتشر ہو گئے اور ساحل پر مزے سے چرنے لگے۔ ایسا ول فریب اور خوش آیند ساحل کوٹک نے اِس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ سلیٹ چٹانوں کی دھاریاں میلوں تک سمندر کے کنارے کنارے چلی گئی تھیں جو دریائی بچھڑوں کے نشیمنوں کے لئے نہایت موزوں تھیں۔ اور اُن کے پیچھے ریت کے چمکتے ہوئے قطعے دور تک پھیلے ہوئے تھے جن پر بچھڑے اپنے کھیلنے کے لئے اکھاڑے بنا سکتے تھے۔ اسکے علاوہ موجیں ساحل سے اِس انداز کے ساتھ آکر ٹکراتی تھیں کہ دریائی بچھڑے اُن میں بڑے لطف سے رقص کی محفل آراستہ کر سکتے تھے اور کنارے سے کچھ دور لمبی لمبی سبز گھاس کا بستر بچھا تھا جس پر ناچنے کے بعد وہ لوٹ لگا سکتے تھے۔ کوٹک کو سب سے زیادہ خوشی جس بات کے دریافت کرنے سے ہوئی وہ یہ تھی کہ وہاں کے پانی میں ایک ایسی کیفیت تھی جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ کوئی انسان یہاں کبھی نہیں آیا۔ سب سے پہلے کوٹک نے اس بات کی طرف سے اپنا اطمینان کر لیا کہ یہاں مچھلیاں بافراط موجود ہیں۔ اور اس لئے اپنی خوراک بہم پہنچانے کے لئے دریائی بچھڑوں کو جو ہجرت کر کے یہاں چلے آئیں خوراک حاصل کرنے کے لئے زیادہ دُور نہیں جانا پڑے گا۔ پھر وہ تیرتا ہوا گیا اور اُن خوش نما چھوٹے چھوٹے ریتیلے جزیروں کو جو دُھند میں پورے نظر نہیں آتے تھے جا کر گن آیا۔ شمال کی طرف سمندر کے اندر چٹانوں اور پہاڑیوں کا ایک سلسلہ دُور تک پھیلا ہوا چلا گیا تھا جس کی وجہ سے ناممکن تھا کہ کوئی جہاز ساحل سے چھ میل کے فاصلہ اندر آ جائے۔ یہ سب کچھ دیکھ چکنے کے بعد کوٹک خوش ہو کر بولا "یہ تو میں گویا نواسس توشنہ میں پھر آ گیا۔

مگر نواس تونشنہ سے یہ جگہ دس حصے زیادہ اچھی ہے۔ دریائی بیل کو میں بیوقوف خیال کرتا تھا مگر وہ تو بڑا عقلمند نکلا۔ آدمی زاد اول تو اس جزیرہ کو جانتے ہی نہیں اور اگر جانتے بھی ہوں تو یہاں وہ آ نہیں سکتے کیونکہ سمندر میں جو چٹانیں ہیں اُن سے ٹکرا کر جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا اگر سمندر میں کوئی مقام محفوظ اور خطرہ سے خالی ہے تو وہ یہی مقام ہے۔ یہ کہہ کر وہ دل میں سوچنے لگا کہ میں اگر اپنی قوم کو یہاں لا کر آباد کر دوں تو کیا ہی مزا ہو۔ اِس لئے اُس نے اِس جزیرہ کو اچھی طرح سے دیکھ بھال کر اور اُس کا پتہ ذہن نشین کر کے نواس تونشنہ کا رُخ کیا۔

گھر پہنچنے میں اُسے دس دن لگے اور جب وہ شیر دریائی کے مسکن کے قریب نواس تونشنہ کے ساحل پر جا کر نکلا تو اُس نے اپنی منگیتر کو جس سے گذشتہ موسم بہار میں اُس کی نسبت ٹھہری تھی اپنا منتظر پایا۔ کوٹک نے محبت بھری نگاہوں سے اپنی معشوقہ کو دیکھا لیکن اس کی نگاہیں ساتھ ہی یہ بھی کہے دیتی تھیں کہ جس جزیرہ کا وہ اتنی مدت سے متلاشی تھا وہ آخر کار اُس نے پا لیا ہے۔

لیکن جب کوٹک نے نئے جزیرہ کی داستان اپنی قوم کو جا کر سُنائی تو مجرد بچھڑوں اور اُس کے باپ بحری صیاد اور نیز باقی کے دریائی بچھڑوں نے اُسے ٹھٹھے میں اُڑا دیا اور ایک نوعمر دریائی بچھڑے نے جو سن میں اُس کے برابر تھا اُس سے کہا "کوٹک حکایت تو تمہاری واقع میں دل کو بہلانے والی ہے لیکن اس کا ہم کو کیسے یقین ہو کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ سچ بھی ہے جب کسی کو اتنا بھی معلوم نہ ہو کہ تم کہاں سے آ رہے ہو۔ تو بھلا تمہارے اس حکم کو کہ ہم سب تمہارے ساتھ ہو لیں کوئی کیسے مانے؟ شاید تم کو خیال نہیں کہ ہم سبھوں نے اپنے اپنے نشیمنوں کو لڑ بھڑ کر حاصل کیا ہے اور تم ہمیشہ لڑائی سے کتراتے رہے ہو۔ چلو سمندر کی سیر میں تم سے تنے چھوٹے" اِس پر باقی کے تمام دریائی بچھڑوں نے قہقہہ لگایا۔ اور جس نوجوان دریائی بچھڑے نے کوٹک پر پھبتی کہی تھی وہ اکڑ کر اپنی گردن کو دائیں بائیں پھرانے لگا۔ اُس کی شادی اسی سال ہوئی تھی اور اسی پر وہ اِترایا پھرتا تھا۔

کوٹک نے جواب دیا۔ میری ابھی شادی نہیں ہوئی کہ میں نشیمن کے لئے لڑتا پھروں۔

اس کے علاوہ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ میں تم سبھوں کو ایک ایسی جگہ دکھاؤں جہاں تم امن اور سلامتی کے ساتھ بے کھٹکے رہ سکو۔ آپس میں لڑنے مرنے سے کیا فائدہ۔؟"

اسپر نوجوان دریائی بچھڑے نے ازراہ تمسخر کہا "لڑنے سے پہلوتہی کرنے کا تم نے اچھا ڈھب نکالا ہے جب تم ایسا کنیاتے ہو تو اور میں کیا کہہ سکتا ہوں"

یہ سن کر کوٹک نہایت برافروختہ ہوا اور اُس نے اپنے حریف کو کڑک کر جواب دیا۔ "اگر تمہارے مقابلہ میں میں جیتوں تو کیا تم میرے ساتھ جہاں میں تم کو لیچلوں چلو گے؟"

نوجوان بچھڑا بے پروائی سے بولا "ہاں ضرور چلوں گا۔ مگر میں دیکھوں تو سہی کہ تم کیسے جیتتے ہو" وہ یہ کہنے نہیں پایا تھا کہ کوٹک نے بجلی کی طرح تڑپ کر اپنے دانت اُس کی گردن میں پیوست کر دئیے۔ پھر اپنے پچھلے پاؤں کے بل کھڑے ہو کر اُس نے اُس زور کی ٹکر اُسے ماری کہ وہ ریت پر چاروں شانے چت گرا۔ اسکے بعد کوٹک نے دہاڑ کر دوسرے دریائی بچھڑوں سے کہا "میں پانچ سال سے تمہارے لئے اپنا لہو اور پسینا ایک کر رہا ہوں۔ میں نے تمہارے واسطے ایک ایسا جزیرہ تلاش کیا جہاں تم کو کسی دشمن کا خوف نہیں اور جہاں امن و آسائش سے تم زندگی بسر کر سکتے ہو لیکن جب تک مارے تھپیڑوں کے تمہارے گوڈر بھرے سروں کا بھرتا نہ بنایا جائے اُس وقت تک تم میری بات کا یقین نہ کرو گے۔ اب میں تم سب کو اپنی بات سنواتا ہوں۔ سنبھل جاؤ"

لمرشن بیان کرتا ہے (اور لمرشن کے بیان کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہر سال ہزارہا بڑے بڑے دریائی بچھڑوں کی لڑائی اُس کے دیکھنے میں آتی ہے) کہ میں نے اپنی تمام عمر میں ایسا زبردست اور خوفناک حملہ نہیں دیکھا جو کوٹک نے دشمنوں پر کیا۔ اُس نے بڑے سے بڑے دریائی سانڈ کو جو اُس کے رستہ میں آیا ٹکر ماری اور اُس کی گردن کو دانتوں سے پکڑ کر اس زور سے جھنجوڑا اور مروڑا کہ اُس کی گھگی بندھ گئی۔ اسکو ادہ موا کرنے کے بعد وہ دوسرے سے جا چپٹا اور پھر اُس کا بھی وہی حال کر کے اُس نے تیسرے کو جا دبوچا۔ دوسرے دریائی بچھڑوں کے برعکس جو سال

میں چار مہینے کچھ نہیں کھاتے کوٹک سال کے شروع سے آخر تک خوب پیٹ بھر کر کھاتا رہاتھا اور سمندر میں متعدد بار سفر کرنے سے جسمانی ورزش کی بدولت اُس میں ایسی طاقت آگئی تھی کہ بیان نہیں ہوسکتی۔ مارے غصہ کے اسوقت اُس کی سفید ایال کا بال بال کھڑا تھا۔ اُسکی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ اُس کے دانت چمک رہے تھے اور دیکھنے میں وہ نہایت شاندار معلوم ہوتا تھا۔ بڈھے بحری صیاد اُس کے باپ نے اُسے اپنے خوفناک حلہ میں سالخوردہ دریائی بچھڑوں کو دہنے بائیں پٹخنیاں دیتے اور نوجوان مجرد بچھڑوں کی صفوں کی صفیں اُلٹتے ہوئے طوفان کی طرح جھپٹتے دیکھا اور اُس نے چلا کر کہا "کوٹک بے وقوف پڑا ہو لیکن تمام ساحل پر لڑنت میں اُس کے برابر کوئی نہیں۔ بیٹا کہیں اپنے باپ کو بھی اُٹھا کر پٹخ نہ دینا وہ تمہارے ساتھ ہے"

اِس کے جواب میں کوٹک اِس زور سے ڈکارا کہ تمام ساحل گونج اُٹھا اور بڈھا بحری صیاد جس کی سانس دہونکنی کی طرح پھول رہی تھی اپنی مونچھوں کو کھڑا کئے اپنے بیٹے کے پیچھے پیچھے اُسکو مدد پہنچانے کے لئے ہولیا۔ ادہر مشکوا اور وہ دریائی بچھڑی جس کی کوٹک سے شادی ہونے والی تھی کھڑی ہوکر اپنے اپنے مردوں کو سراہنے اور اُن کی تحسین کرنے لگیں۔ غرضکہ ایک جنگ عظیم برپا ہوئی اور باپ بیٹے اُس وقت تک برابر لڑتے رہے جب تک کہ ایک دریائی بچھڑے کو بھی مقابلہ کا دعوٰی رہا۔ جب سب کو اُنہوں نے پست کر لیا تو ساحل پر وہ پہلو بہ پہلو ڈکار لیتے ہوئے اکڑ اکڑ کر چکر لگانے لگے

رات کے وقت جب تاروں نے دُہند کی چلمن کے پیچھے سے جھلملانا شروع کیا تو کوٹک ایک چٹان پر چڑہا اور زخمی دریائی بچھڑوں کو دیکھ کر پکارا "اب میں تم کو سبق پڑہا چکا ہوں"

اس پر بحری صیاد نے جس کے پٹھے زخموں سے چور ہونے کے باعث اکڑ رہے تھے کہا "مگرمچھ گھڑیال نے بھی اُن کی وہ گت نہ بنائی ہوتی جو تم نے بنائی ہے۔ بیٹا مجھکو تم پر ناز ہے جس جزیرہ کا تم ذکر کرتے ہو اگر حقیقت میں کوئی ایسا جزیرہ سمندر میں موجود ہے تو میں تمہارے ساتھ وہاں چلونگا"

کوٹک پھر دہاڑ کر بولا "اے سمندر کے موٹے سوڑ وجن کے نہ صرف جسم پر بلکہ عقل پر بھی چربی

چاہتی ہے میری بات تم نے سنی ہے یا نہیں۔ تم میں سے میرے ہمراہ دریائی بیل کی سُرنگ کو کون چلتا ہے؟ جواب دو ورنہ میں پھر تمہاری خبر لیتا ہوں۔"

ہزارہا دریائی بچھڑوں نے جن کی گردنیں کوٹک کے دانتوں سے آشنا ہو چکی تھیں دبی آواز میں جواب دیا "ہم چلیں گے۔ کوٹک سفید بچھڑا جدھر ہم کو لیجائے ہم اُسکے ساتھ جانے کو طیار ہیں۔"

ایک ہفتہ کے بعد کوٹک دس ہزار دریائی بچھڑوں کو لیکر دریائی بیل کی سُرنگ کو سدھارا اور جو دریائی بچھڑے نواس توشنہ میں رہ گئے تھے اُنھوں نے کہا کہ کوٹک اور اُس کے ساتھی احمق اور خبطی ہیں۔ لیکن آئندہ موسمِ بہار میں جب سب آپس میں ملے تو کوٹک کے ہمراہیوں نے اُن نئے ساحلوں کی دلفریبی کا ذکر جو دریائی بیل کی سُرنگ کے دوسری طرف واقع تھے اِس شد و مد کے ساتھ کیا کہ نواس توشنہ سے باقی کے دریائی بچھڑے بھی ہجرت کرنے لگے ہر سال نواس توشنہ اور لوقنن کے ساحلوں سے دریائی بچھڑوں کی ایک تعداد کثیر ترک وطن کرتی حتّٰی کہ تمام دریائی بچھڑے اُس محفوظ اور پُرامن ساحل پر جا کر آباد ہو گئے جہاں کوٹک گرمیوں بھر رہتا ہے اور ہر سال زیادہ جسیم اور زیادہ تنومند ہوتا جاتا ہے اور اُس کے گرد دوسرے نوعمر دریائی بچھڑے ایک ایسے سمندر کے کنارے کھیلا کودا کرتے ہیں جہاں کسی انسان کے قدم نہیں پہنچے۔

سمندر

بہے جا اے یم ژرف و عمیق و تیرہ و اخضر ‏ — ‏ تجھے بیڑوں کی کیا پروا جہازوں سے تجھے کیا ڈر
زمیں کو گرچہ کرتا ہے تبہ اور پائمال انساں ‏ — ‏ تفوّق اُس کا مٹ جاتا ہی ساحل پہ مگر آ کر
تری ہر موج طوفاں خیز ہے منشور بربادی ‏ — ‏ حکومت ہے تو ہی تیری ہی ملکِ آب پر یکسر
نہیں رہتے یہاں آثار باقی اُسکی غارت کے ‏ — ‏ غنیمت بلکہ انساں خود یہاں ہے اور تو غارتگر
اُسے تو غرق کر دیتا ہے مثلِ قطرہ پہنائے ‏ — ‏ حباب آہ کی دستار موجِ آب کی چادر
نہ گور اُس کو میسر ہے نہ حاصل ہے کفن اُسکو ‏ — ‏ نہ پرساں ہے کوئی اُسکا نہ کوئی نوحہ خواں میسر
تری راہوں پر انساں کے قدم جم ہی نہیں سکتے ‏ — ‏ نہیں وہ چھین سکتا تیرے میدانوں سے مال و زر
تو خشم آلودہ ہو کر اور جھنجلا کر جو اُٹھتا ہے ‏ — ‏ تو بس ہوتی ہے اُسکو بس تری موجوں کی اک ٹکر
اُسے حاصل ہے جو طاقت زمیں برباد کرنے کو ‏ — ‏ مچاتا ہے وہ جس کے زعم میں ہر روز شور و شر
تجھے نفرت ہے اس سے اور تو فرطِ حقارت سے ‏ — ‏ لگاتا ہے اُسے سیلاب ہیبت ناک کی ٹھوکر
نہیں رہتا تمرد اُس کا باقی ہو کے سرگرداں ‏ — ‏ وہ جب کھاتا ہے تیرے پُرخطر گرداب میں چکر
اُسے اس بیکسی میں اپنے یاد آتے ہیں اب معبود ‏ — ‏ دُعائیں مانگتا ہے اُنسے ہو کر عاجز و مضطر
کسی ساحل پہ اُسکو پھینک دیتا ہے تو آخر کار ‏ — ‏ ٹپارہ بس زمیں پر مست اُٹھا اے ابن آدم سر
وہ بیڑے جو چمکتے اور گرجتے ہیں دمِ پیکار ‏ — ‏ بسانِ شعلۂ برق و مثالِ نالۂ تندر

* لارڈ بائرن انگلستان کے نامور شاعر نے اپنے مشہور فسانے "چائلڈ ہیرلڈ" میں سمندر سے ان الفاظ میں خطاب کیا ہی میں نے اُسکا ترجمہ اردو نظم میں کر دیا۔ اِس مقام پر اصل کتاب میں رڈیارڈ کپلنگ نے دریائی بجیڑوں کا ایک قومی گیت لکھا ہی لیکن اُسکا ترجمہ اردو دان ناظرین کے کانوں کو نہایت مکروہ معلوم ہوتا اسلئے بجائے اُسکے میں نے یہ سمندر والی نظم درج کر دی ہے۔
(ظفر علی خاں)

ملاتے ہیں جو شہر و قلعۂ سنگیں کو مٹی میں
مٹاتے ہیں جو نقش بارہ و برج و فصیل و در

ہراساں ملک ہیں جن سے لرزتی جن سے ہیں قومیں
پڑے ہیبت سے جن کی کانپتے ہیں تاجور تھر تھر

نہنگِ چوب انہیں کہئے کہ جن کا صانعِ خاکی
عبث نازاں ہی اُس شے پر بنا جسکی ہی پانی پر

انہیں کے بل پہ وہ یہ دعوئ بیہودہ کرتا ہے
کہ تو اُسکا ہے محکوم اور وہ تیرا حاکم و داور

کھلونے ہیں یہ تیرے اور مچل کر بارہا تو نے
انہیں توڑا ہے موجِ آسماں پیکر سے ٹکرا کر

کیا تو نے ہے سر نیچا غرورِ میڈا کا
گیا لُٹ تیرے ہاتھوں سے ہے سامانِ ٹریفلگر

ترے ایک ایک ساحل پر ہی اک اک سلطنت لیکن
بجز تیرے ڈھلیں تغییر کے سانچہ میں سب آخر

ہوئی کیا عظمتِ یونان ہوئی کیا شوکتِ بابل
کہاں ہی کارتھیج کی شاں کہاں دوھا کا کر و فر

زمانہ جب موافق تھا بنایا تیری لہروں نے
تجارت کا اُنہیں مرکز حکومت کا اُنہیں مصدر

بہت سے غاصبوں اور جابروں کو ان پہ تولا یا
بنیں وحشی کی یہ اور غیر کی حلقہ بگوش اکثر

تغیرِ اِس قدر لایا زوال اور انحطاط اُن کا
اُجڑ کر ہو گئے صحرا جہاں آباد تھے کشور

نہیں ممکن مگر اے بحر تجھ میں انقلاب آنا
نہ ہوگا حشر تک بھی ختم تیرا نیلگوں دفتر

ترا حُسن اِس بلا کا ہے نہیں قدرت زمانہ میں
کہ ڈالے جُھرّیاں تیری جبینِ لاجوردی پر

نظر آیا تھا صبحِ کن فکاں کو جس طرح لبریز
اُسی انداز سے اب تک چھلکتا ہے ترا ساغر

تشبیہِ خالقِ بیچون و بے ہمتا ہمیں تجھ میں
دمِ طوفاں نظر آتی ہے اے آئینۂ انور

تموّج تجھ میں پیدا یا تلاطم تجھ میں برپا ہو
سکوں کا یا خموشی کا ہو تو پہنے ہوئے زیور

توڑ ہا نے برف سے قطبِ شمالی و جنوبی کو
دیا کھینچے تو خطِ استوا پر نیل کا مسطر

ہر اک حالت میں تو بے انتہا ہر اور بے پایاں
فراخی تیرا مسلک اور وسعت ہے ترا مشعر

ازل تیرا شبستاں ہے ابد ہے متکا تیرا
بقا تیری ردا ہے اور پہنائے فضا بستر

سبھی کہئے تجھے خدا کے جود و اکرام کی مسند
سبھی لکھئے تجھے خدا کی عظمت و اجلال کا مظہر



رِکّی ٹکّی

بھاگ کر سانپ اپنی بانبی میں گھُسا
رکھ کے اُس پر مُنہ یہ بولا نیولا
دُم دبا کر کس لئے بھاگا ہے تو
اپنے اِس بِل سے ذرا باہر تو آ
موت کا میں ناچ تا تجھ کو نچاؤں
تو بھی دیکھے کیسی ہونی ہے قضا
تیری آنکھوں سے لڑیں آنکھیں مری
تیری گردن سے ملے میرا گلا
زہر اُگلے کھائے پیچ و تاب تو
میں مزے سے پھن چبا جاؤں ترا

یہ کہانی اُس بڑی جنگ کی ہے جو سگولی کی چھاونی کے ایک بنگلہ کے غسل خانہ میں رکّی ٹکّی نے کالے ناگ سے کی۔ اس لڑائی میں رکّی ٹکّی کو بیئے اور چھچھوندر نے مدد دی۔ لیکن یہ مدد صلاح و مشورہ کے متعلق تھی۔ اصلی لڑائی رکّی ٹکّی یکہ و تنہا لڑا۔

رکّی ٹکّی ایک نیولا تھا۔ اپنے پوستین اور دُم کے لحاظ سے وہ ایک چھوٹی سی بلّی معلوم ہوتا تھا۔ مگر سر اُس کا گلہری کے سر کے مُشابہ تھا۔ اُس کی آنکھوں اور اُس کی پھڑکتی ہوئی ناک کے سرے کی رنگت گلابی تھی۔ اپنے جسم کے ہر حصّہ کو وہ اپنے اگلے اور پچھلے پنجوں

میں سے جس نیچہ سے چاہتا تھا کھجا لیتا تھا۔ اپنی دُم کے بالوں کو کھڑا کر کے وہ بالکل بوتل صاف کرنے کے برش کی طرح بنا لیتا تھا اور لمبی لمبی گھاس میں جب وہ کسی دشمن سے لڑنے کے لئے پھرتا تھا تو یہ نعرہ مارتا تھا "رکی ٹک ٹکی ٹک"۔

ایک دن گرمیوں کے موسم میں پانی کا ایک بہت بڑا طوفان آیا اور اُسے اپنے بل میں سے جہاں وہ اپنے باپ اور ماں کے ساتھ رہا کرتا تھا بہا کر لے گیا۔ وہ غوطے کھاتا ہوا جا رہا تھا کہ سڑک کے کنارے کی نالی میں اُس نے ایک پتلی سی ٹہنی تیرتی پائی۔ اُس کو اُس نے پکڑ لیا اور دیر تک اُس سے چپٹا رہا۔ یہاں تک کہ اُسے غش آگیا جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے اپنے آپ کو ایک باغ کی روش پر دھوپ میں پڑا پایا اور ایک چھوٹے سے لڑکے کو یہ کہتے سُنا "یہ نیولا مر گیا ہے۔ اسے اب دفنانا چاہئے"

لڑکے کی ماں جو پاس کھڑی تھی بولی "بیٹا اسے اُٹھا کر لے چلو۔ ابھی یہ مرا نہیں۔ اس کے بدن میں ذرا گرمی پہنچی اور یہ خشک ہوا تو شاید جی اُٹھے گا"

غرضکہ وہ اُسے اُٹھا کر مکان میں لے گئے۔ وہاں ایک قد آور آدمی نے اُسے ہاتھ میں اُٹھا کر دیکھا اور کہا کہ یہ مرا نہیں غوطے کھانے سے صرف اس کا دم گھٹ گیا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے اُسے ایک صاف سے کپڑے میں لپیٹ کر انگیٹھی کے قریب رکھا اور تھوڑی دیر میں اُس نے آنکھیں کھول کر ایک چھینک ماری اور اُٹھ بیٹھا۔

قد آور آدمی نے جو ایک انگریز تھا اور اُس بنگلہ میں حال ہی میں آکر فروکش ہوا تھا کہا "لو وہ ہوش میں آگیا" اسے اب ڈراؤ مت۔ ہم اُسے پالیں گے"

نیولا آدمی سے نہیں ڈرتا۔ کیونکہ ناک سے لیکر دُم تک وہ نئی باتوں کے دریافت کرنے کے شوق سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ نیولوں کی قوم اس اصول پر عمل کیا کرتی ہے کہ "دوڑو اور دیکھو بھالو" چنانچہ رکی ٹکی نے اول اُس کپڑے کو جس میں وہ لپیٹا گیا تھا دیکھا اور فیصلہ کیا کہ یہ چیز کھانے کے قابل نہیں تب اُس نے میز کے گرد ایک چکر لگایا اور پھر ایک

جگہ بیٹھ کر اپنے بالوں کو درست کیا اور اپنے پچھلے پنجے سے اپنی پیٹھ کو کھجایا۔ اس کے بعد وہ کود کر لڑکے کے کندھے پر جا چڑھا۔

لڑکے کے باپ نے یہ دیکھ کر کہا "ٹامی ڈرو مت۔ یہ دوستی کی ابتدا ہے"

ٹامی نے جواب دیا "ابا یہ تو میری ٹھوڑی کو گدگدا رہا ہے"

رکی ٹکی لڑکے کے کالر اور گردن کے درمیان جھانکنے اور اُس کے کان کو سونگھنے کے بعد فرش پہ اُترا اور بیٹھ کر اپنی ناک مَلنے لگا۔

ٹامی کی ماں بولی "جنگلی کمبخت بیہ نیولا ایسی جلدی ہل گیا ہے۔ میرے خیال میں ہم سے اُس کے مانوس ہو جانے کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اُس کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا ہے"

اُس کے خاوند نے جواب دیا "تمام نیولے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اگر ٹامی نے اُس کی دُم کو نہ کھینچا یا اُسے پنجرے میں بند کرنے کی کوشش نہ کی تو وہ دن بھر گھر کے اندر باہر آیا جایا کرے گا لیکن اس وقت اسے کچھ چیز کھانے کو دینی چاہیئے"

غرضکہ انہوں نے کچے گوشت کی ایک بوٹی اُسے دی۔ رکی ٹکی نے بوٹی بڑی رغبت اور ذوق وشوق سے کھائی جب وہ کھا چکا تو برآمدہ میں جا کر دھوپ میں اپنا پوستین سُکھانے کے لئے لیٹ گیا کچھ دیر کے بعد جب اُس کے بال جڑوں تک خشک ہو چکے اور اُس نے اپنی حالت کو نہایت اچھا پایا تو اُس نے اپنے دل سے یہ باتیں کرنی شروع کیں "دنیا بھر کے نیولوں کو اپنی تمام عمر میں اتنی باتیں معلوم نہیں ہو سکتیں جتنی میں اس مکان میں رہ کر دریافت کر سکتا ہوں۔ میں ضرور یہاں رہونگا۔ اور نئی حقیقتیں مجھپر کُھلا کریں گی"

دن بھر وہ مکان میں چکر لگاتا رہا اور چپہ چپہ جگہ اُس نے چھان ماری۔ غسل خانہ میں حمام کرنے کی بالٹی پانی سے بھری رکھی تھی اس میں وہ ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ پھر اُس نے لکھنے کی میز پر چڑھ کر اپنی ناک دوات میں ڈالدی اور تمام کاغذوں کو سیاہی کے قطروں سے آلودہ کر دیا۔ کے بعد اُس نے اپنی ناک جلتے ہوئے چرٹ سے جلالی۔ کیونکہ وہ ٹامی کے باوا کی گودی میں یہ دیکھنے کے

کے لئے جا بیٹھا تھا کہ لکھتے کس طرح سے ہیں۔ جب رات ہوئی تو وہ ٹامی کے سونے کے کمرے میں لمپوں کے روشن کئے جانے کا تماشا دیکھنے کے لئے جا گھسا اور جب ٹامی بستر پر جا سویا تو رکی ٹکی بھی اُس پر جا چڑھا لیکن ٹامی کی طرح اُس نے رات سونے میں نہیں گذاری کیونکہ رات کو ذرا سا کھڑکا ہونے اور خفیف سے خفیف آہٹ پانے پر وہ پلنگ پر سے کود کر اسکا سبب دریافت کرنے کے لئے چلا جاتا۔ جب ٹامی کے ماں باپ اپنی خوابگاہ کو جانے سے پہلے اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لئے آئے تو انہوں نے رکی ٹکی کو ٹامی کے تکیہ پر جاگتا پایا۔ یہ دیکھ کر ٹامی کی ماں نے کہا کہ میں اپنے بچہ کے پلنگ پر نیولے کا موجود ہونا پسند نہیں کرتی ممکن ہے کہ میرے بچے کو وہ کاٹ کھائے۔ اُس کے خاوند نے ہنس کر کہا "تم اُس کی طرف سے اطمینان رکھو۔ اگر ٹامی کی پاسبانی کے لئے ایک تازی کتا رات بھر اُس کے بستر کے پاس بیٹھا رہے تو ٹامی کی وہ اتنی حفاظت نہیں کر سکتا جتنی کہ یہ نیولا کر سکتا ہے۔ اگر اسوقت کوئی سانپ یہاں گھس آئے تو......!!

لیکن ٹامی کی ماں ایسی خوفناک بات کا تصور بھی دل میں لانے کی روادار نہ تھی۔

جب صبح ہوئی تو رکی ٹکی ٹامی کے کندھے پر سوار ہو کر برآمدہ میں آیا جہاں میز پر ناشتہ چُنا ہوا تھا۔ رکی ٹکی کو بھی ایک کیلا اور ایک اُبلا ہوا انڈا کھانے کو ملا جسے کھا کر وہ بہت خوش ہوا اور باری باری سے ہر ایک کی گود میں جا کر بیٹھا۔ رکی ٹکی کی ماں نے جو کسی زمانہ میں سگولی میں فوج کے جرنیل کے بنگلہ میں رہتی تھی اُسے وہ تمام باتیں بتا دی تھیں جن پر ایک نیولے کو جب وہ انسانوں میں جا کر رہے عمل کرنا چاہئے۔

ناشتہ کرنے کے بعد رکی ٹکی باغ میں جو بنگلہ کے چاروں طرف پچاس پچاس گز کے فاصلہ تک پھیلا ہوا تھا گیا۔ اس میں گلاب نیبو اور نارنگی کے پودے کثرت سے موجود تھے کہیں کہیں بانسوں کے جھنڈ اور لمبی لمبی گھاس بھی تھی۔ رکی ٹکی اس منظر کو دیکھ کر خوشی سے اپنے ہونٹ چاٹنے لگا اور بولا کہ اس سے زیادہ خوش آیند شکارگاہ میرے لئے اور کہاں ہو سکتی ہے یہ کہہ کر وہ باغ میں گشت لگانے لگا۔ پھرتے پھرتے اُس نے ایک جھاڑی میں نہایت غمزدہ

تھے انڈے بچے اور اُس کی جورو کی مینیں۔ ان دونوں نے دو بڑے پتوں کو موڑ کر کناروں پر دیئے سے بخیہ کیا تھا اور بیچ میں روئی اور ملائم پر جا کر اپنے لئے ایک ننھا سا خوش نما گھونسلا بنایا تھا۔ گھونسلا ہوا میں اِدھر اُدھر جھول رہا تھا اور وہ اُس کے اوپر بیٹھے ہوئے گریہ وزاری کر رہے تھے۔

رکی ٹکی نے اُن سے پوچھا "تمہارے اس قدر دلگیر ہونے کا کیا سبب ہے"۔

بیا بولا "ہم نہایت ہی بدنصیب ہیں کل ہمارا ایک بچہ گھونسلے میں سے گر پڑا اور ناگ اُسے کھا گیا"۔

اس پر رکی ٹکی نے کہا "واقعی یہ ایک افسوس ناک بات ہے مگر میں یہاں نوواردہوں مجھے بتاؤ کہ ناگ کون ہے؟"

اس وقت بیا اور اُس کی جورو اپنے گھونسلے میں رکی ٹکی کو جواب دئے بغیر دبک گئے کیونکہ کچھ دور گھنی لمبی لمبی گھاس میں سے ایک پھن دار سانپ کے پھنکار مارنے کی آواز آئی۔ یہ آواز ایسی خوفناک تھی کہ رکی ٹکی دفعتہً جست بھر کر دو فیٹ پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے بعد ایک بہت بڑے کالے ناگ نے جو زبان سے لیکر دُم تک پانچ فیٹ لمبا ہوگا۔ بتدریج اپنا پھن گھاس میں سے بلند کیا۔ جب وہ اپنے جسم کا ایک تہائی حصہ زمین سے اوپر اُٹھا چکا تو ٹھہر کر اِدھر اُدھر جھومنے لگا اور رکی ٹکی کو اُس خبث سے بھری ہوئی نگاہ سے دیکھنے لگا جس کے لئے سانپ مشہور ہے اور جو کبھی نہیں بدلتی خواہ سانپ کسی خیال میں ہو۔

کچھ دیر کے بعد وہ بولا "تو نے پوچھا تھا کہ ناگ کون ہے۔ مجکو دیکھ لے۔ میں ہی ناگ ہوں۔ جب برہم دیوتا دھوپ میں سو رہا تھا اور ناگ نے اپنے پھن سے اُس پر سایہ کیا تو دیوتا نے ہماری تمام قوم پر اپنا نشان لگا دیا۔ دیکھ اور ڈر"۔

یہ کہہ کر اُس نے اپنا پھن پہلے سے بھی زیادہ پھیلایا اور رکی ٹکی نے اُس کی پشت پر عینک کا سا نشان دیکھا۔ کچھ دیر کے لئے تو رکی ٹکی خوف زدہ ہو کر کھڑا رہا لیکن نیولے کا زیادہ دیر تک خوف میں مبتلا رہنا ایک ناممکن سی بات ہے۔ اس کے علاوہ اگرچہ رکی ٹکی کو کسی زندہ

ناگ سے اس سے پہلے مُٹ بھیڑ نہیں ہوئی تھی لیکن اُس کی ماں اُسے مرے ہوئے ناگ کھلایا کرتی تھی اور وہ جانتا تھا کہ نیولے کا بڑے ہو کر بھی کام ہے کہ سانپوں سے لڑا کرے اور انھیں مار کر کھا جایا کرے ناگ کو بھی یہ بات معلوم تھی اور اگرچہ بظاہر وہ شیخی بگھار رہا تھا لیکن دل میں وہ نیولے سے ڈرتا تھا۔

آخر کار رکی ٹکی نے اپنی دُم کو پُھلا کر کہا "نشان و شان تو میں جانتا نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ تم نے گھونسلے سے گرے ہوئے ایک ننھے سے بے پر و بال بچے کو کھا کر ایک نہایت پاجیانہ حرکت کی۔"

ناگ اس وقت کچھ سوچ رہا تھا اور رکی ٹکی کے پیچھے گھاس میں خفیف سی جنبش ہونے کا منتظر تھا وہ خوب جانتا تھا کہ نیولوں کے باغ میں آجانے کا مطلب یہ ہے کہ زود و دیر اُس کا اور اُس کے خاندان بھر کا استیصال ہو جائے۔ لیکن اس وقت اُس کا مقصد یہ تھا کہ رکی ٹکی کو غافل کر دے چنانچہ اُس نے اپنا سر تھوڑا سا ایک طرف کو جُھکا دیا اور بولا "آؤ ہم تم باتیں کریں تم انڈے کھاتے ہو۔ کیا وجہ ہے کہ میں بچے نہ کھاؤں۔"

بیا اس وقت بے تحاشا چلایا "اپنے پیچھے دیکھو۔ اپنے پیچھے پلٹ کر دیکھو۔"

یہ سُنتے ہی رکی ٹکی جس قدر بلند اُچھل سکتا تھا ہوا میں اُچھلا اور اُس کے جست بھرتے ہی عین اُس کے نیچے ناگ کی ناپاک جورو ناگن دو دو زبانیں نکالتی ہوئی زناٹا بھر کے نکلی جس وقت رکی ٹکی ناگ سے باتیں کر رہا تھا تو وہ دبے پاؤں اُس کے پیچھے اُس کا خاتمہ کرنے کے لئے چلی آئی تھی۔ اور جب اُس کا وار خطا گیا تو رکی ٹکی نے اُس کو طیش میں آکر پھنکار مارتے سُنا۔ رکی ٹکی عین اُس کی پیٹھ پر گرا اور اگر وہ تجربہ کار نیولا ہوتا تو اُس کو یہ بات معلوم ہوتی کہ ایک برکی سے ناگن کی پیٹھ توڑ ڈالنے کا یہی موقعہ ہے مگر اُس کو ناگن کے پلٹ کر ڈسنے کا خوف تھا۔ بہر حال اُس نے کاٹا تو سہی مگر زخم زیادہ گہرا نہیں پڑا اور وہ ناگن کی پیٹھ پر سے کود کر اُسے زخمی اور غضبناک چھوڑ کر علیحدہ ہو گیا۔

شاخ پر جو گھونسلا بنا تھا ناگ اُس کی طرف اپنے تمام بدن کو اُٹھا کر جھپٹا اور پھنکار مار کر پکارا "اے بدذات بئے یہ سب تیری کرتوت ہے" مگر بئے نے اپنا نشیمن اِس قدر بلند بنایا تھا کہ سانپ وہاں پہنچ نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ ناگ کی کچھ پیش نہ گئی اور گھونسلا ہوا میں جھولتا رہا۔

رکی ٹکی کی آنکھیں اس وقت سرخ انگار کی طرح دہکنے لگیں (جب نیولے کی آنکھیں سرخ ہو جائیں تو جان لو کہ وہ غضبناک ہے) اور وہ اپنی دُم اور پچھلی ٹانگوں کے بل ایک کنکر کے بچے کی طرح بیٹھ کر چاروں طرف نگاہ دوڑانے اور فرط غضب سے بڑبڑانے اور چرچرانے لگا لیکن ناگ اور ناگن گھاس میں غائب ہو گئے تھے۔ جب سانپ کا وار خطا جاتا ہے تو وہ کوئی ایسی بات نہیں کرتا جس سے معلوم ہو کہ اس کے بعد وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ رکی ٹکی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ دونوں کا تعاقب کرے کیونکہ اُسکو اس بات کا یقین نہ تھا کہ وہ ایک ہی وقت میں دو سانپوں سے عہدہ برآ ہو سکے گا۔ غرضکہ وہ دوڑتا ہوا گیا اور ایک کنکروں سے کٹی ہوئی روش پر جو بنگلہ کے قریب تھی بیٹھ کر سوچنے لگا۔ یہ موقعہ اُس کے لئے نازک تھا۔ جانوروں کے حالات میں جو قدیم کتابیں موجود ہیں اُن کو اگر تم پڑھو گے تو تم اُن میں یہ لکھا ہوا پاؤ گے کہ جب نیولے اور سانپ کی لڑائی ہوتی ہے اور سانپ نیولے کو ڈس لیتا ہے تو نیولا بھاگا ہوا جاتا ہے اور کوئی بوٹی کھا لیتا ہے جس سے وہ اچھا ہو جاتا ہے۔ لیکن اصل میں ایسا نہیں ہے۔ سانپ اور نیولے کی لڑائی میں ہار جیت نگاہ کی تیزی اور پاؤں کی پھرتی پر منحصر ہے۔ سانپ جس وقت نیولے کو ڈسنے کے لئے اپنا سر پلکوں کی جھپک سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھاتا ہے تو نیولا اُچک کر الگ ہو جاتا ہے۔ اگر اچکنے کی حالت میں سانپ کا وار کارگر ہوا تو نیولے کا خاتمہ ہے لیکن نیولا اکثر بچ ہی جاتا ہے۔ اور اس کی پاؤں کی پھرتی اکثر اُس کے کام آتی ہے۔ رکی ٹکی کو یہ معلوم تھا کہ میں ابھی ایک کمسن نیولا ہوں۔ اور اِس بات کو خیال میں لانے سے کہ ایک سانپ نے پیچھے سے اُس پر وار کیا تھا اور اُس نے اپنے آپ کو اُس سے بچا لیا اُسے بڑی خوشی ہوئی اس سے اُسکو اپنے اوپر بھروسا ہو گیا۔ اور جب

ٹامی بھاگتا ہوا ادھر سے گذرا اور اُس سے پیار کرنے لگا تو اُس نے اپنے آپ کو اُس پیار کا مستحق خیال کیا۔

رات کو جب ٹامی سونے لگا تو رکی ٹکی کو بھی اُس نے اپنے ساتھ سونے کے لئے تکیہ پر لٹا دیا۔ لیکن ناگ اور ناگن کے خیال نے رکی ٹکی کے لئے نرم اور گدگدے تکیہ کو کانٹوں کا بستر بنا دیا۔ جب ٹامی سو گیا تو وہ بستر پر سے کود کر مکان کے گرد اپنا رات کا گشت لگانے کے لئے چلا۔ اندھیرے میں چھچھوندر سے اُس کی مٹ بھیڑ ہو گئی۔ چھچھوندر ایک نہایت ہی بودے دل کا جانور ہے۔ رات بھر دیواروں سے ملا ملا چوں چوں کیا کرتا ہے اور دل کڑا کر کے کمرے کے بیچ میں آنے کی ہزار کوشش کرتا ہے مگر کبھی وہاں تک نہیں پہنچتا۔

غرضکہ چھچھوندر نے رو کر کہا "مجھے مت مار۔ رکی ٹکی مجھے چھوڑ دے"

رکی ٹکی نے حقارت کے لہجہ میں جواب دیا "کیا تیرا خیال ہے کہ جو سانپوں کو مارتا ہے وہ چوہیوں کو بھی مارے گا۔؟"

چھچھوندر پہلے سے بھی زیادہ دلزدہ ہو کر بولی "جو سانپوں کو مارتے ہیں وہ سانپوں کے ہاتھوں مارے بھی جاتے ہیں مجھے کیسے یقین ہو کہ ناگ کسی رات کو اندھیرے میں مجھے رکی ٹکی سمجھ کر نہ کھا جائے گا۔"

رکی ٹکی بولا "ڈرو مت۔ ناگ باغ میں رہتا ہے اور میں جانتا ہوں کہ تم وہاں نہیں جاتیں"

چھچھوندر نے کہا "میری خالہ زاد بہن گھونس نے مجھ سے کہا تھا کہ"

اتنا کہہ کر چھچھوندر رک گئی اور رکی ٹکی نے اُس سے پوچھا "اُسنے تم سے کیا کیا کہا تھا"؟

اس کے جواب میں چھچھوندر نے کہا "خاموش رکی ٹکی ناگ ہر جگہ اور ہر وقت موجود ہے۔ تمہیں چاہئے تھا کہ گھونس سے اس کے متعلق باغ میں گفتگو کرتے"

رکی ٹکی جھلا کر بولا "بتاتی ہو یا نہیں ورنہ کاٹتا ہوں۔ جلدی بولو"

بیچاری چھچھوندر یہ دھمکی سنکر رونے لگی اور منت وسماجت سے یہ کہنے لگی "میں نہایت

بیکس ہوں۔ میں تم سے کیا کہوں۔ رکی ٹکی کیا تمہیں سنائی نہیں دیتا۔؟"

رکی ٹکی نے کان لگا کر سنا۔ مکان میں ہر طرف سناٹا تھا۔ ایک خفیف سی صدا جو کھڑکی کے آیئنہ پر بیتے کے چلنے کی آواز سے زیادہ نہ تھی اُسے محسوس ہوئی۔ یہ آواز اینٹوں پر کسی سانپ کے کھپروں کی سرسراہٹ کی تھی۔

رکی ٹکی نے دل میں کہا "ہو نہ ہو یہ ناگ ہے یا ناگن جو غسل خانہ کی موری کی راہ سے رینگتی ہوئی اندر آ رہی ہے۔" پھر وہ بآواز بلند بولا "بہن چھچھوندر تمہارا خیال صحیح ہے مجھے اس بارہ میں گھونس سے گفتگو کرنی چاہئے تھی۔"

یہ کہہ کر وہ دبے پاؤں ٹامی کے غسل خانہ کی طرف گیا مگر وہاں اس نے کچھ نہ پایا۔ اس کے بعد اُس نے دوسرے غسل خانہ کا رُخ کیا جو ٹامی کی ماں کی خوابگاہ سے ملا ہوا تھا۔ یہاں پہنچکر اُس نے سُنا کہ ناگ اور ناگن باہر چاندنی میں کچھ سرگوشیاں کر رہے ہیں۔

ناگن اپنے خاوند سے یہ کہہ رہی تھی "جب اِس گھر میں آدمی نہ رہیں گے تو نیولا خواہ مخواہ چلا جائیگا اور تب باغ کے ہم پھر پورے مالک ہو جائیں گے۔ تم چپکے سے اس بدرو کی راہ سے اندر جاؤ اور سب سے پہلے بڑے آدمی کو جو اس گھر کا مالک ہے ڈسو۔ اس کے بعد ہم دونوں مل کر رکی ٹکی کا فیصلہ کر ڈالیں گے۔"

اس کے جواب میں ناگ کو رکی ٹکی نے یہ کہتے سُنا "مگر یہ تو بتاؤ کہ آیا آدمیوں کی جان لینے سے ہمیں کچھ فائدہ بھی ہے۔"

ناگن بولی "بہت بڑا فائدہ ہے۔ تم دیکھتے نہیں کہ جب تک اس بنگلہ میں آدمی نہ تھے اُس وقت تک باغ میں کوئی نیولا بھی نہ آیا تھا۔ جب تک بنگلہ خالی ہے تم باغ کے بادشاہ اور میں ملکہ ہوں۔ اِس کے علاوہ تمہیں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ خربوزوں کی فالیز میں ہمارے انڈوں میں سے سئے جا چکنے کے بعد جب بچے نکلیں گے تو اُن کو امن و آرام کے ساتھ رہنے کے لئے زیادہ جگہہ کی ضرورت ہوگی۔"

اس پر ناگ نے کہا "اچھا میں جاتا ہوں مگر اس کی ضرورت نہیں کہ ہم بعد میں رکی ٹکی کا شکار کریں اگر مجھ سے ہو سکا تو میں قد آور آدمی اور اُس کی بی بی اور بچہ کو ماروں گا اور چپکے سے واپس چلا آؤں گا تب بنگلہ خالی ہو جائیگا اور رکی ٹکی خود بخود چلا جائے گا"

رکی ٹکی نے جب یہ بات سُنی تو مارے غصہ اور نفرت کے وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ کچھ دیر نہ گذری تھی کہ ناگ کا پھن موری کے سرے پر نمودار ہوا اور اس کے بعد اُس کا پانچ فیٹ لمبا دھڑ اندر داخل ہوا۔ رکی ٹکی پر اس بڑے ناگ کے تن و توش کو دیکھ کر باوجود اپنے غیظ و غضب کے خوف چھا گیا۔ ناگ نے کُنڈلی مار کر اپنا پھن اوپر اُٹھایا اور اندھیرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور رکی ٹکی نے اُس کی آنکھوں کو چمکتا پایا۔

اس وقت ناگ نے ناگن سے پکار کر کہا "میں صبح تک بچے کے باپ کے یہاں آنے کا انتظار کرتا ہوں۔ اُس نے غسل خانہ میں قدم رکھا اور میں نے اُسے ڈسا۔ ناگن تم میری بات سُن رہی ہو"

چونکہ باہر سے کوئی جواب نہیں آیا اس لئے رکی ٹکی نے جان لیا کہ ناگن چلی گئی ہے ناگ کنڈلی مار کر پانی کی بالٹی کے قریب لیٹ گیا۔ اور رکی ٹکی دم بخود ہو کر منتظر رہا۔ ایک گھنٹہ کے بعد اُس نے آہستہ آہستہ بالٹی کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ناگ اُس وقت بے خبر سو رہا تھا۔ رکی ٹکی نے اُس کی زبردست پیٹھ کو دیکھ کر تعجب کیا اور یہ سوچنا شروع کیا کہ سب سے بہتر مقام گرفت کے لئے کونسا ہو سکتا ہے۔ اپنے دل ہی دل میں وہ بولا "اگر میں نے پہلی ہی جست میں اُس کی پیٹھ نہ توڑ ڈالی تو وہ پھر بھی لڑ سکے گا۔ اور اگر وہ لڑا تو بس یار رکی تمہاری خیر نہیں" پھر اُس نے ناگ کی موٹی گردن پر جو پھن کے نیچے تھی نظر ڈالی۔ مگر یہ جگہ اُس کے قابو سے باہر تھی اور اگر وہ دُم کے قریب کاٹتا تو سوائے اسکے کہ ناگ جھلا اُٹھتا اور کوئی نتیجہ نہ نکلتا۔

آخر کار وہ بولا "سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ میں ناگ کے ٹینٹوے کو جو پھن کے اوپر

ہے جاؤ بچوں اور ایک دفعہ میرے دانت اُس میں گڑ جائیں تو اُسکو چبا کر ہی چھوڑوں"
یہ کہہ کر اُس نے جست بھری اور ناگ کے سر کو اپنے دانتوں میں دبا لیا۔ اسوقت جو کشمکش عظیم ہوئی وہ دیکھنے کے قابل تھی۔ ناگ نے پیچ و تاب کھا کھا کر ہر طرف پٹکنا شروع کیا۔ کبھی وہ اپنا سر زمین پر پٹختا تھا اور کبھی اپنا جسم فرش پر کوڑے کی طرح مارتا تھا۔ رکّی ٹکی کی اگرچہ تھپیڑے کھا کھا کر وہی حالت ہو رہی تھی جو ایک گھونس کی اُس وقت ہوتی ہے جب کتا اُسے پکڑ کر جھنجھوڑتا ہے لیکن وہ بھی ناگ کو بے طرح چپٹا ہوا تھا اور اُسکی آنکھیں دہکتے انگار کی طرح سُرخ ہو رہی تھیں۔ اس جدّ و جہد اور کشمکش میں صابن دان اور کیسہ اور ایک دو برتن نیچے گر پڑے اور ٹین کی بالٹی ناگ کے جسم کے تھپیڑے کھا کھا کر اسی طرح بجنے لگی جیسے گھڑیال بجتا ہے۔ رکّی ٹکی نے دل میں یہ سمجھ کر کہ اب میں نہیں بچتا۔ اس خیال سے ناگ کے سر میں اپنے دانتوں کو اور زیادہ پیوست کیا اور اپنے دونوں جبڑوں کو اور زیادہ زور سے ملایا کہ مروں گا تو دشمن کو بھی ساتھ لیکر مرونگا۔ اُس کا سر بھنّا رہا تھا اور اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گویا اُس کے جسم کے پرخچے اُڑے جا رہے ہیں۔ اس وقت دفعۃً ایک بڑا بہت دہما کا ہوا۔ گرم ہوا کے ایک جھونکے نے اُسے بیہوش کر کے نیچے گرا دیا اور ایک سُرخ شعلے کی لپٹ نے اُس کی کھال کو جھلس دیا۔ بات اصل میں یوں تھی کہ ٹامی کا باپ شور سُن کر جاگ اُٹھا تھا اور اُس نے ایک چھرّے کی بندوق کی دونوں نالیاں ناگ پر اُس کے پھن کے پاس خالی کر دی تھیں۔

رکّی ٹکی نے جب آنکھیں کھولیں تو ناگ کو بالکل مُردہ پایا کیونکہ اب اُس میں ذرا حس و حرکت نہ تھی۔ ٹامی کے باپ نے اُسے زمین پر سے اُٹھا لیا اور پیار کر کے اپنی بی بی سے جو قریب ہی کھڑی تھی کہا "دیکھو ایلیس! اس نیولے کی بدولت ہماری جان بچی" ٹامی کی ماں نے جس کے چہرہ پر مارے خوف کے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں ناگ کو جس کی دھجیاں بندوق نے اُڑا ڈالی تھیں دیکھا اور ایسی کالی بلا سے محفوظ رہنے پر خدا

کا شکر ادا کیا۔ رکی ٹکی اپنے جسم کو گھسیٹتا ہوا ٹامی کی خوابگاہ میں پہنچا اور وہاں باقی کی آدھی رات اُس نے اپنے جسم کے پرپرزوں کو ہلا کر اس بات کے تحقیق کرنے میں گذاری کہ آیا میرے چالیس ٹکڑے تو نہیں ہو گئے۔

جب صبح ہوئی تو اُس نے اپنے پٹھوں کو نہایت اکڑا ہوا پایا لیکن با ایں ہمہ اپنے کارنامہ پر دل ہی دل میں خوش ہو کر یہ کہہ رہا تھا "ناگ کو تو میں نے مار لیا۔ اب صرف ناگن سے دو دو ہاتھ کرنے باقی رہتے ہیں۔ مگر اُس کے ساتھ لڑنا پانچ ناگوں کے ساتھ ایک وقت میں مقابلہ کرنے سے کم نہیں اور یہ معلوم نہیں کہ جن انڈوں کا وہ ذکر کرتی تھی اُن میں سے بچے کب نکلنے والے ہیں۔ مجھے چاہئے کہ جا کر بیئے سے ملوں اور اُس سے اِس بارہ میں گفتگو کروں۔"

ناشتہ کا انتظار کئے بغیر رکی ٹکی بھاگتا ہوا باغ میں گیا اور اُس درخت کے نیچے پہنچا جس پر بیئے کا گھونسلا بنا تھا بیئے کو اُس نے بلند آواز سے فتح و نصرت کا گیت گاتے سُنا۔ ناگ کے مارے جانے کی خبر تمام باغ میں پھیل گئی تھی کیونکہ مہتر نے اُسے گھوڑے پر پھینک دیا تھا۔

بیئے سے رکی ٹکی نے خفا ہو کر کہا "اے بیوقوف یہ کونسا گانے کا موقعہ ہے؟"

بیا رکی ٹکی کی سُنے بغیر اپنی کہے گیا اور اِس طرح گائے گیا "ناگ مارا گیا ناگ مارا گیا۔ بہادر اور سور مار کی ٹکی نے اُسے سر سے پکڑ کر دبائے رکھا اتنے میں بڑا آدمی دھماکے والی لکڑی اپنے ساتھ لایا اور ناگ کے پرخچے اُڑ گئے۔ اب وہ میرے بچوں کو کبھی نہیں کھائیگا۔"

رکی ٹکی نے باحتیاط تمام چاروں طرف نگاہ دوڑا کر کہا "یہ سب سچ ہے لیکن یہ تو بتا کہ ناگن کہاں ہے؟"

بیئے نے خوشی کے جوش میں رکی ٹکی کے سوال کی طرف کچھ التفات نہ کیا اور یہ کہے گیا "ناگن غسل خانہ کی موری کے پاس آئی اور ناگ کو پکارنے لگی۔ ناگ نکلا تو سہی لیکن

ایک لکڑی کے سرے پر مہتر نے اُسے اُٹھا کر گھورے پر ڈال دیا ہمیں چاہئے کہ بہادر سرخ آنکھوں والے رکی ٹکی کی تعریف کا راگ گائیں۔" اور یہ کہہ کر اُس نے نہایت خوش الحانی سے چہچہانا شروع کیا۔

رکی ٹکی نے جھنجھلا کر کہا "اگر میں تیرے گھونسلے تک پہنچ سکوں تو تیرے بچوں کو نیچے گرا دوں۔ یہ تو نے کیا بے موقعہ ٹرٹر لگا رکھی ہے تو تو اپنے گھونسلے میں مزے سے بیٹھا ہوا گا رہا ہے لیکن مجھے ابھی ایک دشمن کی طرف سے کھٹکا لگا ہوا ہے۔ اے بیٹے اپنے اس گیت کو تھوڑی دیر کے لئے موقوف کر۔"

بیٹے نے جواب دیا "اچھا میں بہادر اور خوبصورت رکی ٹکی کی خاطر سے اپنے گیت کو موقوف کرتا ہوں۔ اے ناگ کے مارنے والے تیرا کیا حکم ہے؟"

رکی ٹکی "میں تو پوچھتا ہوں کہ ناگن کہاں ہے؟"

بیا "وہ اصطبل کے قریب گھوڑوں کی لید کے ڈھیر کے پاس بیٹھی ہوئی ناگ کا سوگ کر رہی ہے۔ سفید دانتوں والا رکی ٹکی بڑا بہادر اور سورما ہے۔"

رکی ٹکی "تیری اور تیرے ساتھ میرے سفید دانتوں کی ایسی تیسی! کیا تو مجھے یہ بتا سکتا ہے کہ ناگن اپنے انڈے کہاں رکھتی ہے؟"

بیا "خربوزوں کے فالیز میں باغ کی دیوار کے اُس حصہ کے قریب جہاں دن بھر دھوپ رہتی ہے۔ کئی ہفتہ ہوئے کہ ناگن نے اُنہیں وہاں چھپا دیا تھا۔"

رکی ٹکی "تم نے یہ بات مجھے پہلے سے کیوں نہ بتائی؟"

بیا "تم کہیں اُس کے انڈوں کو تو نہیں کھانا چاہتے ہو؟"

رکی ٹکی "کھاؤں گا تو نہیں۔ مگر ہاں اُن کو جا کر دیکھوں گا ضرور۔ اے بیٹے تیرے دماغ میں اگر ایک خشخاش کے دانہ کے برابر بھی عقل ہے تو تجھے چاہئے کہ تو اڑ کر اصطبل کو جائے اور وہاں یہ بہانہ کرے کہ تیرا پر ٹوٹ گیا ہے اور اس طرح ناگن کو اپنے پیچھے پیچھے

یہاں تک لے آئے۔ میں خربوزوں کے فالیز کی طرف جانا چاہتا ہوں اور اگر میں اسوقت وہاں چلا گیا تو ناگن مجھے دیکھ لیگی۔

بیا نہایت احمق تھا اور ایک وقت میں ایک خیال سے زیادہ اُس کے دماغ میں نہیں سماتا تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ ناگن کے بچے بھی اُس کے بچوں کی طرح انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں اور اس لئے اُن کا مارنا قرین انصاف نہیں لیکن بیئے کی بی بی زیادہ سمجھدار تھی اور جانتی تھی کہ "افعی راکشتن وبچہ اش رانگاہ داشتن کار خردمنداں نیست" چنانچہ وہ بیئے کو گھونسلے میں بچوں کی نگرانی کے لئے چھوڑکر خود اصطبل کی طرف اُڑ گئی۔ گھوڑے کے قریب پہنچکر ناگن کے سامنے وہ پھڑکنے لگی اور گریہ وزاری کرکے یہ کہنے لگی "ہائے میرا پر ٹوٹ گیا۔ ظالم لڑکے نے جو اس بنگلے میں رہتا ہے پتھر مار کر میرا پر توڑ ڈالا" یہ کہہ کر وہ پہلے سے بھی زیادہ بیقرار ہو کر پھڑپھڑانے لگی۔

ناگن نے اپنا پھن اُٹھایا اور پھنکار مار کر بولی "مال زادی تو ہی تھی جس نے رکی ٹکی کو چوکنا کر دیا ورنہ میں نے اُس کو اُسی وقت مار ڈالا ہوتا اب لنگڑاتی ہوئی یہاں کس لئے آئی ہے۔ میں کیا تجھکو چھوڑوں گی؟" یہ کہہ کر وہ بیئے کی بی بی کی طرف بڑھی۔

بیئے کی بی بی نے مضطربانہ آواز میں چیخ کر کہا "لڑکے نے میرا پر پتھر مار کر توڑ ڈالا"

اس پر ناگن نے طنز سے جواب دیا "تو خاطر جمع رکھ میں لڑکے سے تیرا بدلا لے لوں گی مرتے مرتے تیرا یہ ارمان بھی نکل جائے گا۔ میرے خاوند کی لاش آج صبح اگر گھورے پر پڑی ہے تو کیا ہوا۔ سورج ڈوبنے نہ پائیگا کہ میں اس مکان والے لڑکے کو اُس نیند کے پہلو میں جا کر لٹا دوں گی جس سے وہ پھر کبھی نہ جاگے گا۔ یہ گرتی پڑتی تو کہاں جا رہی ہے اس سے کچھ فائدہ نہیں میں ابھی تجھے آلیتی ہوں۔ اے احمق ذرا مجھ سے آنکھ تو ملا"

بیئے کی بی بی ایسی احمق نہ تھی کہ ناگن سے آنکھ ملاتی کیونکہ جس پرندے کی آنکھ ایک دفعہ سانپ سے لڑ جاتی ہے وہ ایسا مبہوت اور از خود رفتہ ہو جاتا ہے کہ اپنی جگہ سے ہل

نہیں سکتا۔ غرضکہ بٹے کی بی بی پرپھڑپھڑاتی اور لڑکھڑاتی ہوئی بھاگی اور ناگن تیزی سے اُس کی طرف جھپٹی۔

رکی ٹکی نے ان دونوں کو اس انداز سے جاتے ہوئے دیکھا اور وہ بہ سرعت تمام خربوزوں کے فالیز کی طرف جہاں بٹے نے اُسے ناگن کے انڈوں کا پتہ دیا تھا دَوڑا ہوا گیا۔ یہاں اُس نے ایک گوشہ میں پچیس انڈے چھوٹی مرغی کے انڈوں کے برابر چھپے ہوئے پائے لیکن چھلکے کی بجائے ان پر سفیدی لئے ہوئے رنگ کے پوست کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔

رکی ٹکی نے یہ دیکھ کر کہا "میں عین وقت پر پہنچا۔ اگر ایک دن کی بھی دیر لگ جاتی تو اُن انڈوں سے بچے نکل آتے" انڈوں کے پوست کے اندر ناگ کے بچے لپٹے ہوئے پڑے تھے اور رکی ٹکی خوب جانتا تھا کہ انڈے سے نکلتے ہی ناگ کا بچہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ آدمی یا نیولے کو مار ڈالے۔ غرضکہ اُس نے جلد جلد انڈوں کو کھٹک کر بچوں کو کچلنا شروع کر دیا۔ کچھ کچھ دیر کے بعد وہ تمام خولوں کو الٹ پلٹ کر یہ دیکھ لیتا تھا کہ کوئی انڈا رہ تو نہیں گیا۔ آخرکار صرف تین انڈے رہ گئے اور رکی ٹکی مارے خوشی کے ناچنے اور کھلکھلا کر ہنسنے لگا لیکن یکایک اُس نے بٹے کی بی بی کو یہ چلاتے سُنا۔

"رکی ٹکی میں ناگن کو گھر کی طرف لیگئی تھی۔ اور وہ برآمدہ میں چلی گئی۔ جلد آ کیونکہ وہ کسی کو ڈسا چاہتی ہے"

یہ سُنتے ہی رکی ٹکی نے دو انڈوں کو تو کچل ڈالا اور تیسرے کو مُنہ میں دبا کر برآمدہ کی طرف جتنی جلدی اُس سے دوڑا جا سکتا تھا لپکا۔ ٹامی اور اُس کے ماں باپ صبح کے ناشتہ کے لئے میز پر بیٹھے تھے لیکن رکی ٹکی نے دیکھا کہ وہ کچھ نہیں کھا رہے ہیں۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے تھے اور اُن کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ناگن ٹامی کی کرسی کے پاس چٹائی پر کنڈلی مار کر سر اُٹھائے جھومتی ہوئی فتح و نصرت کا گیت گا رہی تھی اور ٹامی کی ننگی

ناگن اُس کے منہ سے اِس قدر قریب تھی کہ وہ آسانی سے جب چاہتی اُسے ڈس سکتی تھی۔
آخر کار ناگن پھنکار مار کر بولی "اے اُس قد آور آدمی کے بیٹے جس نے میرے ناگ کو مار کر میرا سُہاگ لوٹ لیا ہے ذرا ٹھہرو میں ابھی تیار نہیں ہوں تم تینوں کے تینوں خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھے رہو۔ تم اپنی جگہ سے ہلے اور میں نے تمہیں ڈسا۔ اور اگر تم نہ ہلے تب بھی میں نے تمہیں ڈسا۔ اے احمقو تم نے میرے ناگ کو مار کر کیا پھل پایا؟"
ٹامی کی نگاہ اپنے باپ پر جم رہی تھی اور اُس کے باپ نے آہستہ سے اُس سے صرف اسی قدر کہا "ٹامی ہلو جلو مت اپنی جگہ پہ بے حس و حرکت بیٹھے رہو۔"
اس وقت رکی ٹکی آپہنچا اور پکارا "اے ناگن خبردار ہو جا۔ میں آپہنچا ہوں۔ پلٹ اور مجھ سے لڑ۔"
ناگن اپنی آنکھ پھیرے بغیر بولی "تجھ سے لڑنے کا ابھی وقت نہیں آیا۔ تھوڑی دیر میں آجائے گا۔ رکی ٹکی ذرا اپنے دوستوں کی طرف تو دیکھ کہ اُن کی کیا حالت ہو رہی ہے بے حس و حرکت بیٹھے ہیں اور اُن کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ میرا خوف اُن پر ایسا چھا رہا ہے کہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے اور اگر تو ایک قدم بھی اور نزدیک آیا تو میں اپنا وار کر جاؤں گی۔"
اس کے جواب میں رکی ٹکی نے کہا "خربوزوں کے فالیز میں باغ کی دیوار کے قریب اپنے انڈوں کو تو جا کر دیکھ کہ اُن کی کیا حالت ہو رہی ہے۔"
یہ سُنتے ہی ناگن نے اپنا آدھا رُخ پھیر لیا اور برآمدہ میں ایک انڈے کو پڑا ہوا دیکھ کر بولی "رکی ٹکی یہ مجھے دے ڈال۔"
رکی ٹکی کی آنکھیں اُس وقت خون کی طرح سُرخ ہو رہی تھیں۔ اُس نے انڈے کو اپنے دونوں پنجوں کے درمیان رکھ کر کہا "اس ایک سانپ کے انڈے کی کیا قیمت ہوگی؟ کل جھول میں یہ ایک ہی رہ گیا ہے باقی کے انڈوں کو تو چیونٹیاں کھا رہی ہیں۔"

ناگن پوری پلٹ کر رکی ٹکی کی طرف متوجہ ہوئی اور اُس ایک انڈے کے بیٹے سب کچھ بھول گئی۔ رکی ٹکی نے دیکھا کہ ٹامی کے باپ نے اپنا ہاتھ بسرعت تمام بڑھا کر ٹامی کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے جہاں ناگن اُس تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہ دیکھ کر اُس نے قہقہہ لگایا اور بولا "دہوکا کھا گئی۔ دم میں آگئی۔ رِک ٹِک ٹِک، بالڑکا اب صحیح وسلامت ہے اور وہ میں ہی تھا جس نے گئی رات غسل خانہ میں ناگ کو پھن پر سے جا دبوچا" اتنا کہہ کر رکی ٹکی مارے خوشی کے اُچھلنے اور کودنے لگا۔ اور جب اُس کا جوشِ مسرت ذرا کم ہوا تو وہ پکارا "ناگ نے مجھے بہت کچھ جھٹکے دیئے لیکن میں بھی اُس کے گلے کا ہار ہو گیا۔ اور جب لڑکے کے باپ نے آکر اُس کے دو ٹکڑے کر ڈالے تو اُس کا دم پہلے ہی نکل چکا تھا میں نے بھی اُسے کیا ہی رگیدا۔ رکی ٹکی ٹِک ٹِک! آ بلا اب تو میرے گلے لگ تجھکو بھی وہی ناچ نہ نچاؤں تو میرا نام رکی ٹکی نہیں۔ اِس رنڈاپے کا تجھے زیادہ دن سوگ نہ کرنا پڑیگا"

ناگن نے دیکھا کہ اب ٹامی کے مارنے کا موقعہ ہاتھ سے جاتا رہا ہے اور انڈا رکی ٹکی کے پنجوں کے درمیان رکھا ہے۔ اُس وقت اُس نے بہ منت وسماجت ہوتے سے کہا "رکی ٹکی مجھے میرا یہ انڈا جو ایک ہی رہ گیا ہے دے ڈال۔ میں یہاں سے چلی جاؤں گی اور پھر کبھی نہ آؤں گی۔

رکی ٹکی نے جواب دیا "یہ تو تو نے واقع میں سچ کہا۔ کیونکہ تو بھی ناگ کے ساتھ گھورے کے ڈھیر کی طرف چلی جائے گی اور وہاں سے کبھی واپس نہ آئے گی۔ رانڈ لڑتی کیوں نہیں۔ ادہر آ اور لڑ۔ لڑکے کا باپ بندوق لینے گیا ہے۔ تو بھی کوئی دم میں چھیچھڑا بنا چاہتی ہے"

رکی ٹکی ناگن کا وار خالی دینے کے لئے اُس کے چاروں طرف اُچھل رہا تھا اور اُس کی آنکھیں جلتے انگار کی طرح سُرخ ہو رہی تھیں۔ ناگن بار بار سنبھل کر اُس پر حملہ کرتی تھی اور وہ ہر دفعہ آگے یا پیچھے کو اُچھل کر اُس کی ضرب سے بچ جاتا تھا۔ رکی ٹکی یہ کوشش

کر رہا تھا کہ کسی طرح ناگن کے پیچھے ہو جائے اور ناگن چکر کاٹتی ہوئی اپنا سر اُس کے سر کے مقابل میں رکھنے کی کوشش کر رہی تھی اور چٹائی پر اُس کی دُم کی سرسراہٹ کی آواز ایسی ہی آ رہی تھی جیسی خشک پتوں میں ہوا کے اُڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔
رکی ٹکی انڈے کو بھول گیا تھا۔ انڈا ابھی تک برآمدہ میں پڑا ہوا تھا اور ناگن اُسکے قریب پہنچتی جاتی تھی یہاں تک کہ جب رکی ٹکی دم لینے کے لئے ذرا رکا تو اُس نے انڈے کو اپنے منہ میں دبا کر برآمدہ کی سیڑھیوں کا رُخ کیا اور تیر کی طرح جھپٹتی ہوئی چلی گئی اور رکی ٹکی اُس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ جب ناگن اپنی جان بچانے کے لئے بھاگتی ہے تو وہ اُسی تیزی سے جاتی ہے جس سے کہ تیز سے تیز گھوڑا چابک کھا کر دوڑتا ہے۔
رکی ٹکی یہ بات خوب جانتا تھا کہ اگر اس وقت اُس نے ناگن کو نہ پکڑ لیا تو تمام مصیبتیں از سرِ نو تازہ ہو جائیں گی۔ ناگن نے سیدھا اُس لمبی گھاس کا رُخ کیا جو بیٹے کے گھونسلے کے نیچے تھی اور رکی ٹکی نے اثنائے تعاقب میں بیٹے کو ابھی تک اپنا خوشی کا راگ گاتے سُنا لیکن بیٹے کی بی بی زیادہ سمجھدار تھی۔ وہ اپنے گھونسلے سے اُڑ کر ناگن کے سر کے قریب اپنے پروں کو پھڑپھڑانے لگی اور اگر بیٹے نے اُس کی مدد کی ہوتی تو انہوں نے ناگن کو لوٹا دیا ہوتا لیکن ناگن نے صرف اپنا پھن نیچا کر دیا اور لپکی ہوئی چلی گئی۔ بہر حال اس ایک لمحہ کے توقف کے باعث رکی ٹکی اُس تک آ پہنچا اور جونہیں کہ وہ اُس گھونس کے بل میں جس میں وہ ناگ کے ساتھ رہا کرتی تھی گھسی تو رکی ٹکی نے اپنے دانتوں سے اُس کی دُم پکڑ لی۔ اور بل میں اُس کے ساتھ کھنچا ہوا چلا گیا۔ بہت کم نیولے خواہ وہ کیسے ہی دانشمند اور تجربہ کار کیوں نہ ہوں ایسے ہوں گے جنہیں ایک ناگ کی بانبی میں جانے کی جُرأت ہوگی۔ بانبی میں روشنی تام کو نہ تھی اور رکی ٹکی کو یہ معلوم نہ تھا کہ کب یہ تنگ نائے ختم ہوگی اور ناگن کو یہ موقعہ ملے گا کہ پلٹ کر اُس پر چوٹ کرے بہر حال وہ اپنے دانتوں سے اُس کی دُم کو مضبوط پکڑے رہا۔ تھوڑی دیر میں بل کے

سُن کر گھاس کا ہلنا موقوف ہوگیا اور بیا پکارا: "افسوس رکی ٹکی کا خاتمہ ہوگیا ہمیں اُس کا نوحہ پڑھنا چاہئے۔ افسوس بہادر رکی ٹکی نے جان دی کیونکہ زمین کے تلے ناگن اُس کو یقیناً مار ڈالے گی۔"

غرضکہ بیا رکی ٹکی کے ماتم میں ایک دردناک گیت جو اُس نے فی البدیہہ تیار کیا تھا گانے لگا لیکن یہ مرثیہ ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ گھاس میں پھر ایک جنبش پیدا ہوئی اور رکی ٹکی سوراخ میں سے اپنی مونچھوں کو چاٹتا ہوا باہر نکلا۔ بیئے نے اُسے دیکھتے ہی خوشی کا ایک نعرہ مارا اور اپنے نوحہ کو موقوف کیا۔ رکی ٹکی نے اپنے پوستین سے گرد و خاک کو جس سے وہ آلودہ ہو رہا تھا جھٹک کر ایک چھینک ماری اور بولا "اُس کا خاتمہ ہوگیا۔ رانڈ اپنی بانبی میں سے اب کبھی باہر نہ آئے گی۔" بھورے رنگ کی چیونٹیاں جو گھاس میں رہتی ہیں یہ سُن کر چھتوں میں جمع ہونی شروع ہوئیں تاکہ رکی ٹکی کے قول کی جا کر تصدیق کریں۔

باغ کے تمام پرندے ناگن کے مرنے کی خبر سُن کر خوشی سے چہچہانے لگے اور مینڈک بھی خوش ہو کر غائیں غائیں کرنے لگے کیونکہ ناگ اور ناگن نہ صرف چھوٹے چھوٹے پرندوں بلکہ مینڈکوں کو بھی کھایا کرتے تھے۔

جب رکی ٹکی گھر پہنچا تو ٹامی کی ماں نے جسے غش سے ابھی افاقہ ہوا تھا اور ٹامی کے باپ نے اُسے باری باری سے اُٹھا کر پیار کیا اور اُن کے جوش کی یہ کیفیت تھی کہ اُن کی آنکھوں سے خوشی اور شکر کے آنسو نکل آئے۔ رکی ٹکی کو اس رات طرح طرح کی نعمتیں کھانے کو ملیں اور اُس نے اتنا پیٹ بھر کر کھایا کہ اور زیادہ نہ کھا سکا۔ جب سونے کا وقت آیا تو رکی ٹکی ٹامی کے کندھے پر سوار ہو کر اُس کے ساتھ اُس کی خواب گاہ کو گیا اور اُس کے تکیہ پر سر رکھ کر سو گیا۔

ٹامی کے ماں اور باپ جب اپنی خواب گاہ کو جانے سے پہلے اپنے بچے کو دیکھنے آئے تو رکی ٹکی کو اُس کے ساتھ سوتا پا کر بولے "یہ نیولا ہمارے حق میں خدا کی رحمت

ثابت ہوا۔ اس نے ہماری اور شامی کی جان بچائی۔"

نیولوں کی نیند زیادہ گہری نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہ آواز سُن کر وہ یکایک جاگ اُٹھا اور کہنے لگا۔"

اخاہ آپ ہیں۔ اب آپکو کس بات کا فکر ہے۔ باغ میں جتنے ناگ تھے اُن سب کا خاتمہ ہو چکا ہے اور اگر نہ بھی ہوا ہو تو کیا میں یہاں موجود نہیں ہوں؟"

رکی ٹکی نے جو کارہائے نمایاں کئے تھے اُن پر وہ جتنا فخر کرتا تھوڑا تھا لیکن اُسے کبھی غرور نہیں ہوا اور وہ باغ پر اپنی اُچھل کود اور پکڑ اور کاٹ سے اُسی طرح مسلط رہا جیسے ایک نیولے کو رہنا چاہیئے حتٰے کہ تمام باغ سانپوں سے پاک ہو گیا اور کسی سانپ کو پھر یہ جُرأت نہ ہوئی کہ اُس کی چاردیواری کے اندر اپنی شکل دکھائے۔

بیئے کا گیت

جو اُس نے رکی ٹکی کی مدح میں گایا

گویا بھی ہوں اور درزی بھی ہوں میں
یگانہ ہوں سینے میں گانے میں یکتا

مجھے ناز ہے اپنے میٹھے سُروں پر
مجھے فخر ہے اپنی بخیہ گری کا

ہوا گونجتی ہے مرے چہچہوں سے
چمن میں ہے میرے ترانوں کا چرچا

سیا چونچ سے میں نے اپنا نشیمن
نہ اُدھڑے گا اس میرے بخیے کا ٹانکا

سنا کوئی میٹھی سی بچّوں کو لوری
دل اپنے دلاروں کا بی بی تو بہلا

ہمیں جن کا ڈر تھا وہ سب مر چکے ہیں
نہیں اب کسی کا رہا ہم کو کھٹکا

وہ افعی کہ پھنکار جن کی غضب تھی
بنے ہیں نہنگِ اجل کا نوالہ

بچی جان جس کی بدولت ہماری
ہمیں جس نے قیدِ بلا سے چھڑایا

لقب رکی ٹکی ٹِک اسکا ہے اور وہ
جری ہے بہادر ہے اور ہے توانا

ہیں شعلے کی مانند سرخ اُسکی آنکھیں
ہیں دانت اُسکے ہمرنگِ عاج مصفّٰی

پرندے ہیں ممنونِ احسان اُس کے
ادا اُن سے شکر اُس کا پورا نہ ہوگا

بنائیں جنوردم کو سر کو کریں خم
بیاں بلبلیں پھر کریں وصف اُس کا

تماں سے اگر ہو سکے مدح اُس کی
سُنو ہمدمو پھر قصیدہ یہ میرا

جب بیا یہاں تک پہنچا تو رکی ٹکی نے اُسے جھڑک دیا اور اِس لئے ہم اُس کا قصیدہ نہیں سُن سکے ✣



ہاتھیوں والا توماہی

یعنے ایک مہاوت کے لڑکے کا قصہ

کیوں نہ آئے یاد رہ رہ کر مجھے بے اختیار — وہ زمانہ لوٹتا تھا جب میں جنگل کی بہار
مجھکو زنجیروں سے اور رسّوں سے نفرت کیوں نہ ہو — جبکہ آزادی مرا مسلک تھا پہلا اور شعار
بیٹھ اپنی آدمی کے ہاتھ بیچوں گا نہ میں — اس کے بدلے گو میں پاؤں ایکھ کے گٹھے ہزار
اپنے ہمجنسوں سے بن میں جا کے پھر ملتا ہوں میں — پھر میں اپنے ہمدموں سے جا کے ہوتا ہوں دوچار
نور کے تڑکے سے پہلے توڑ کر یہ بیڑیاں — میں پہنچ جاؤنگا بن میں اور رہوں گا ہم کنار
اپنے اُن بچھڑے ہوئے ہمجولیوں سے جن کی یاد — میرے دل میں اب کھٹکتی رہتی ہے مانندِ خار
کھاؤنگا جنگل کی پاکیزہ ہوا میں صبح تک — تر کریگی میرے دامن کو مصفّےٰ جوئبار

کالے ناگ نے گورنمنٹ ہند کی خدمت میں سینتالیس سال تک کی تھی

اور چونکہ جس زمانہ میں وہ پکڑا گیا تھا اُس وقت اُس کی عمر پورے بیس سال کی تھی اس لئے اب

اُس کی عمر ستر سال کے قریب ہوگی جو ہاتھی کے لئے ایک اچھی خاصی عمر ہے۔ اُسے وہ وقت یاد تھا جب کہ اُس نے ایک توپ کو جو کیچڑ میں دہنس گئی تھی اپنی زبردست مستک کا زور لگا کر نکالا تھا۔ لیکن یہ واقعہ جنگ افغانستان سے جو ۱۸۴۲ء میں ہوئی پہلے کا ہے اور اُس وقت اُس کا پورا نشو ونمانہ ہوا تھا۔ اُس کی ماں رادہا پیاری نے جو اُسی ہانکے میں پکڑی گئی تھی جس میں کالا ناگ پکڑا گیا تھا اُسے اُس کے دودھ کے دانت گرنے سے پہلے یہ نصیحت کی تھی کہ جو ہاتھی ڈرتے ہیں وہ ہمیشہ چوٹ کھاتے ہیں۔ کالے ناگ کو اس نصیحت کا عمدہ ہونا بہت جلد معلوم ہوگیا کیونکہ جب اول اول اُس نے ایک بم کا گولہ پھٹتا دیکھا تو وہ پلٹ کر چیختا ہوا بھاگا اور بندوقوں کی ایک قطار میں جو کھڑی وضع میں چنی رکھی تھیں جا گھسا اور سنگینوں کی نوکیں جا بجا اُس کے جسم میں چُبھ گئیں۔ غرضکہ پچیس سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے اُس نے خوف کھانا چھوڑ دیا اور اِس لئے گورنمنٹ آف انڈیا کے تمام ہاتھیوں میں وہ سب سے زیادہ چہیتا بن گیا۔ اور اُس کی نگہداشت دوسروں کے مُقابلہ میں زیادہ احتیاط کے ساتھ ہونے لگی۔ اُس نے شمالی ہندوستان میں فوج کے ساتھ پندرہ پندرہ من وزنی خیموں کو اُٹھا کر کوچ کیا تھا۔ وہ ایک جہاز میں سوار ہوکر کئی دن تک سمندر کا سفر کرنے کے بعد ایک پہاڑی اور اجنبی ملک میں اپنی پیٹھ پر ایک توپ اُٹھا کر چلا تھا۔ اور اُس نے شہنشاہ تھیوڈور کو مگڈالا میں مرا پڑا دیکھا تھا اور پھر جہاز میں سوار ہوکر سپاہیوں کے قول کے مطابق جنگِ حبش کا تمغہ حاصل کرکے ہندوستان کو واپس آیا تھا۔ اس کے دس سال بعد اُس نے اپنے ساتھ کے ہاتھیوں کو ایک مقام میں جو علی مسجد کہلاتا ہے سردی اور لقوہ اور سرسام اور فاقہ سے مرتا دیکھا تھا اور پھر وہ کئی ہزار میل کے فاصلہ پر مولمین کے لکڑی کے کارخانہ میں ساگوان کے بڑے بڑے شہتیر اُٹھانے اور اُن کے انبار لگانے کے کام پر بھیجا گیا تھا۔ یہاں اُس نے ایک دفعہ ایک نوعمر ہاتھی کو جو کام کرنے سے جی چُراتا تھا ایسا مارا کہ اُسے ادھ موا کرکے چھوڑا۔

اِس کے بعد شہتیر اُٹھانے کی خدمت سے وہ سبکدوش کردیا گیا اور پچانش سالٹھ

دوسرے سدھائے ہوئے ہاتھیوں کے ساتھ گارد کے بن میں جنگلی ہاتھیوں کے پکڑنے میں مدد دینے پر مامور کیا گیا۔ گورمنٹ ہند ہاتھیوں کی نگہداشت اور حفاظت میں نہایت تندہی سے کام لیتی ہے۔ ایک پورا محکمہ اس غرض سے قایم کیا گیا ہے کہ جنگلی ہاتھیوں کو پکڑ کر سدھایا جائے اور وقتاً فوقتاً جب ضرورت پڑے تو انھیں اطراف واکناف سلطنت میں کام پر بھیجا جائے۔ کالے ناگ کا قد دس فٹ تھا اور اُس کے دانتوں کو پانچ فٹ کے طول پر سے کاٹ ڈالا گیا تھا اور سروں پر تانبے کے چھلے چڑھا دئے گئے تھے تاکہ وہ پھٹ نہ جائیں۔ لیکن ان کٹے ہوئے دانتوں سے بھی کالا ناگ وہ کام لے سکتا تھا جو ایک بے سدھا ہاتھی اپنے نوکیلے اور تیز دانتوں سے نہ لے سکتا۔ جب کئی ہفتوں کے بعد احتیاط سے ہانکا کر کے چالیس یا پچاس جنگلی ہاتھی اُس لکڑ کوٹ میں جو پہلے سے تیار ہوتا تھا لاکر قید کر دئے جاتے تھے تو کالا ناگ اپنے مہاوت کا حکم پاتے ہی اس ہیبت ناک غول میں جس کے جوش وخروش کی کوئی انتہا نہ ہوتی تھی (رات کے وقت جبکہ مشعلوں کی روشنی میں فاصلہ کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا تھا) گھس جاتا تھا اور بڑے سے بڑے اور وحشی سے وحشی ہاتھی کو ٹکر کرا تنا پیٹتا تھا کہ وہ خاموش ہو جاتا تھا اور اس اثنا میں دوسرے ہاتھیوں پر جو لوگ سوار ہوتے تھے وہ باقی کے چھوٹے ہاتھیوں کو رسّوں سے جکڑ لیتے تھے۔ لڑائی کے جتنے ڈھب اور گُر تھے تجربہ کار کالے ناگ کو سب یاد تھے کیونکہ اُس نے اپنے زمانہ میں ایک سے زیادہ دفعہ زخمی شیر کے حملہ کا جم کر مقابلہ کیا تھا۔ جب شیر دھاڑ کر اُسے تھپیڑ مارنے کے لئے اُچھلتا تو وہ اپنی نرم سونڈ کو حریف کے زبردست چنگال کی ضرب سے محفوظ رکھنے کے لئے ہوا میں بلند اُٹھا کر بہ سُرعت تمام اپنے سر کی ایک ٹکر سے اُس کو اس حالت میں جبکہ وہ ابھی ہوا میں معلق ہوتا تھا نیچے گرا دیتا اور جھک کر اپنے گھٹنے اُسکے جسم پر ٹیک دیتا اور اُس کا کچومر نکال دیتا۔

ایک دن اُس کے مہاوت اتوریا نامی نے جو اُس مہاوت کا بیٹا تھا جو کالے ناگ کو حبش لیگیا تھا اور اُس مہاوت کا پوتا تھا جس نے کالے ناگ کو پکڑا تھا کہا۔ "کالا ناگ کسی چیز

سے نہیں ڈرتا۔ ڈنا گراُس کو کسی کا ہے تو میرا ہے۔ تین نسلوں سے ہم اُس کی کھلائی اور رکھوالی کرتے چلے آئے ہیں۔ میرا دادا اُس کا پہلا مہاوت تھا۔ پھر میرا باپ ہوا اُس کے بعد میں اور ابھی امید ہے کہ میرے بیٹے کا وہ اور ساتھ دے گا۔

یہ سُن کر اتوریا کے بیٹے تومائی نے کہا "کالا ناگ مجھ سے بھی ڈرتا ہے" تومائی اتوریا کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اُس کی عمر دس سال کی ہوگی۔ اُس وقت اُس کا قد چار فٹ سے زیادہ نہ تھا اور ایک لنگوٹی کے سوا اُس کے جسم پر اور کوئی کپڑا نہ تھا۔ دستور کے موافق بڑا ہونے پر اُس کو اپنے باپ کی جگہہ کالے ناگ کی گردن پر ملنے والی تھی اور وہ اُس لوہے کے آنکس کا مالک بننے والا تھا جو اُس کے باپ اور دادا اور پردادا کے ہاتھ میں رہ کر گھس گیا تھا۔ تومائی کو اپنی بات پر پورا بھروسا تھا کیونکہ وہ کالے ناگ کے سامنے ہی پل کر اتنا بڑا ہوا تھا ابھی اُسنے چلنا بھی نہ سیکھا تھا کہ وہ اس دیو پیکر ہاتھی کی سونڈ کے ساتھ بے کھٹکے کھیلا کرتا تھا اور جب اُس نے چلنا سیکھا تو وہ اکثر اکیلا اُس کو گھاٹ پر پانی پلانے کے لئے لیجانے لگا۔ کالے ناگ کی مجال نہ تھی کہ تومائی کی حکم عدولی کرے کیونکہ وہ اُس دن سے اُس کا مطیع و فرمانبردار ہو گیا تھا جبکہ اتوریا نے اپنے ننھے سے بچے کو اُس کے دانتوں کے قریب لے جاکر رکھدیا تھا اور اُس سے کہا تھا کہ اسکو جو آگے چل کر تیرا مالک بننے والا ہے سلام کر۔ غرضکہ تومائی قدم بڑھائے ہوئے کالے ناگ کے قریب گیا اور کہنے لگا "تو بابا توپتا سے ڈرتا ہے یا مجھ سے" یہ کہہ کر اُس نے ہاتھی کو حکم دیا کہ اپنا پاؤں زمین سے اُٹھائے۔ اور اُس دیو ہیکل جانور نے ایک ٹانگ برابر بچے کے حکم پر اپنے پاؤں یکے بعد دیگرے زمین سے اُٹھائے۔

تومائی نے اپنے باپ سے جو باتیں وقتاً فوقتاً سُنی تھیں اُنہیں اُس نے اپنے ذہن میں رکھا تھا چنانچہ اُس وقت اُس نے اپنا سر ہلا کر کالے ناگ سے یوں خطاب کیا "سرکار ہاتھیوں کی قیمت بڑی ادا کیا کرے مگر اصل میں وہ ہم مہاوتوں کا مال ہیں۔ کالے ناگ! جب تو بڈھا ہو جائے گا تو کوئی دولتمند راجہ آکر تیرے قد و قامت اور تیرے عادات و اطوار سے

خوش ہوکر تجھ کو سرکار سے خرید ے گا۔ اور پھر تجھے سوا ے اس کے اور کوئی کام نہ ہوگا کہ کانوں میں سونے کے بالے پہن کر اور پیٹھ پر ایک طلائی عماری رکھ کر اور زربفت اور سُرخ مخمل کی جُھول اوڑھ کر تو راجہ کے ہاتھیوں کے آگے آگے چلے۔ تب میں چاندی کا انکس لیکر تیری گردن پر بیٹھوں گا۔ اور راجہ کے جلو کے آدمی سونے کے عصا ہاتھ میں لیے ہمارے آگے آگے یہ پکارتے ہوئے دوڑیں گے " مہاراج کا ہاتھی آتا ہے۔ لوگو ہٹ جاؤ۔ اے کالے ناگ وہ بڑے لطف کا زمانہ ہوگا مگر اس میں اتنا لطف نہ ہوگا جتنا اس وقت جنگل میں ہاتھیوں کے پکڑنے میں ہے۔"

یہ سُن کر اتوریا نے کہا " ابھی تجھے دنیا کی نئی نئی ہوا لگی ہے اور تیرے مزاج میں ارنے کی سی وحشت ہے مجھے تو جنگلوں اور پہاڑوں میں مارے مارے پھرنا پسند نہیں۔ میں بڈھا ہو چلا ہوں اور جنگلی ہاتھیوں سے مجھے اب چنداں اُنس نہیں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ ایک بڑا سا فیل خانہ ہو اور ہر ایک ہاتھی کے لئے جدا جدا تھان ہوں اور بڑے بڑے کھونٹے ہوں۔ جن سے اُن کو بہ حفاظت باندھا جا سکے اور چوڑی چوڑی سڑکیں ہوں جہاں اُن کو پھرایا جائے یہ کیمپ کی زندگی مجھے نہیں بھاتی۔ کانپور کی بارکوں میں جب ہم رہتے تھے تو کیا ہی لطف سے کٹتی تھی۔ بازار پاس تھا۔ سودا سلف بڑی آسانی سے لا سکتے تھے۔ اور دن میں صرف تین گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔

نوعمر تومائی کو وہ زمانہ یاد تھا جبکہ وہ کانپور میں اپنے باوا کے ساتھ فیلخانہ میں رہا کرتا تھا۔ لیکن وہ کچھ نہیں بولا۔ اسکو کیمپ میں زندگی بسر کرنے سے بالطبع رغبت تھی اور وہ چوڑی چوڑی سڑکوں کو جن پر ہاتھی روزمرہ جا کر چارہ اُٹھا لاتے تھے اور اُس کبھی نہ کٹنے والے وقت کو جبکہ کالے ناگ کو اپنے تھان میں اودھر سے اُدھر جھومتا اور سر پر خس و خاشاک اُڑاتا دیکھنے کے سوائے اور کسی چیز پر اُس کی نظر نہیں پڑتی تھی سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا جن باتوں سے اُس کی طبیعت کو مناسبت تھی وہ یہ تھیں کہ تنگ اور ناہموار پہاڑی پگڈنڈیاں

جنہیں ہاتھی کے سواے اور کوئی اختیار نہیں کرتا اُس کی تگ و دو کے لئے موجود ہوں وادیوں کا سہانا نشیب پیش نظر ہو جنگلی ہاتھی کئی میل کے فاصلہ پر چرتے ہوئے دکھائی دیں۔ کالے ناگ کے پاؤں کے بیچ میں سے سؤر خوف کھاکر بھاگتے ہوں اور مور شور مچا کر پر پھڑپھڑاتے ہوئے اُڑتے ہوں۔ مینہ موسلادہار برس رہا ہو اور پہاڑیوں اور وادیوں پر گھنگور گھٹا چھائی ہوئی ہو۔ کہر کی چادر میں لپٹی ہوئی صبح کا خوش نما منظر سامنے ہو جبکہ کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ رات کہاں گذرے گی۔ جنگلی ہاتھی نہایت احتیاط کے ساتھ ہانک کر لکڑ کوٹ میں لائے جائیں اور جب وہ دیکھیں کہ ہم چاروں طرف سے گھر گئے ہیں اور کہیں نکل نہیں سکتے تو دیوانہ وار بھاری بلّیوں کی طرف ٹکر مارنے کے لئے جھپٹیں لیکن آدمیوں کی چیخ پکار، مشعلوں کی دہک اور بھڑک اور خالی کارتوسوں کی بوچھاڑ سے پھر پلٹ جائیں ایسے موقعہ پر تومائی کی خوب بن آتی تھی۔ اپنی مشعل ہاتھ میں لیکر وہ اُسے زور زور سے ہلاتا اور خوب ہی شور و غل مچاتا تھا۔ لیکن اصلی لطف اُس وقت آتا تھا جبکہ ہاتھیوں کو پکڑنا شروع کرتے تھے اور لکڑ کوٹ معرکہ قیامت کا نمونہ نظر آتا تھا اور آدمی آپس میں اشاروں سے باتیں کرتے تھے کیونکہ کان پڑی آواز بھی سُنائی نہیں دیتی تھی۔ اُسوقت نوعمر تومائی لکڑ کوٹ کی ایک لرزتی ہوئی بلّی پر اپنے بالوں کو شانوں پر بکھیرے مشعلوں کی روشنی میں بھتنے کی صورت بنا ہوا چڑھ جاتا۔ اور جب شور دار و گیر ذرا بھی فرو ہو جاتا تو رسّوں کی پھٹکار، پتّوں اور شاخوں کے پاؤں میں روندے جانے کی کڑکڑاہٹ۔ اور بندھے ہوئے ہاتھیوں کی چیخوں میں اُس کی گھنٹی کی سی آواز کالے ناگ کو ان لفظوں میں بڑھاوا دیتی ہوئی سننے میں آتی "شاباش کالے ناگ شاباش! دینا اسے ایک دانت! سنبھلنا سنبھلنا! مارنا مارنا! دیکھنا سامنے بلّی ہے اُس سے بچنا!" غرضکہ کالے ناگ اور جنگلی ہاتھی کی لڑائی لکڑ کوٹ کے اندر زور شور سے جاری رہتی اور بڈھے فیلبان اپنے ماتھے سے پسینا پونچھتے اور نوعمر تومائی کو بلّیوں پر خوشی سے کھسکتا ہوا دیکھکر از راہ تحسین کبھی کبھی سر سے اشارہ

بھی کر دیتے۔

تومائی بلیوں پر صرف کھسکتا ہی نہیں تھا بلکہ فرط جرأت سے اور بھی کچھ کر بیٹھتا تھا۔ ایک رات کا ذکر ہے کہ ہاتھیوں کو پکڑ رہے تھے اور شور قیامت برپا تھا۔ تومائی اس حالت میں بلّی کے اوپر سے پھسل کر لکڑ کوٹ کے اندر آ تر پڑا اور لڑتے ہوئے ہاتھیوں کے دھکم دھکے نیچے سے گذر کر اُس نے ایک رسا جو ایک مہاوت کے ہاتھ سے نیچے گر پڑا تھا اُٹھا کر اُسے دیدیا۔ یہ مہاوت ایک ہاتھی کے بچے کے پاؤں میں جو بے طرح دولتیاں پھینک رہا تھا۔ رسے کی کمند کا حلقہ پھنسانا چاہتا تھا (مخفی نہ رہے کہ بڑے ہاتھیوں کے پکڑنے میں اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی بچوں کے پکڑنے میں) ہاتھی کا بچہ بڑی مشکل سے قابو میں آتا ہے اور بڑا مرکھنا ہوتا ہے) قصہ مختصر یہ کہ کالے ناگ نے تومائی کو اس حالت میں دیکھ لیا اور اُسے اپنی سونڈ سے اُٹھا کر اتوریا کے حوالے کر دیا۔ اتوریا نے وہیں اُسے دو چار تھپڑ لگائے اور پھر لے جا کر بلّی پر بٹھا دیا۔ جب صبح ہوئی تو تومائی کو اُس کے باوا نے سخت ملامت کرنے کے بعد کہا "ابے او نالائق کیا فیلخانے کے پختہ تھان اور خیمہ برداری تیرے لئے کافی نہیں جو تو ہاتھیوں کے پکڑنے میں حصہ لینا چاہتا ہے تو بڑا ہی ناشدنی ہے۔ دوسرے شکاریوں نے جن کی تنخواہ میری تنخواہ سے کم ہے اس معاملہ کا ذکر جا کر پیٹرسن صاحب سے کر دیا ہے" نوعمر تومائی یہ سُن کر ڈر گیا۔ اُسے انگریزوں کے زیادہ حالات معلوم نہیں تھے لیکن اُس کے نزدیک پیٹرسن صاحب دنیا بھر میں سب سے بڑا انگریز تھا کیونکہ جنگلی ہاتھیوں کے پکڑنے کے متعلق جو کارروائی ہوتی تھی وہ سب اُس کے حکم سے ہوتی تھی اور انگریزی سرکار کے لئے وہی تمام ہاتھی پکڑتا تھا۔ اور ہاتھیوں کے حالات جتنے پیٹرسن صاحب کو معلوم تھے اتنے کسی اور شخص کو معلوم نہ تھے۔

تومائی نے گھبرا کر پوچھا "اب کیا ہوگا؟"

اتوریا نے جواب دیا "ہوگا یہ کہ ہمارے خاندان پر آفت آئے گی۔ پیٹرسن صاحب

تو دیوانہ ہے ورنہ وہ کیوں ان وحشی دیووں کے پکڑنے میں اپنی عمر صرف کرے ۔ ممکن ہے کہ تیرا حال سن کر وہ تجھے بھی ہاتھی پکڑنے کی خدمت سپرد کرے جس کا یہ نتیجہ ہو کہ کسی دن تو کسی جنگلی ہاتھی کے پاؤں کے تلے کچل ڈالا جائے ۔ پرمیشر نہ کرے کہ ایسا ہو لیکن اگر ایسا ہوا تو میرا خاندان برباد ہو جائے گا اور میری نسل مٹ جائے گی ۔ اے شریر اور نالائق بچے مجھے ڈر ہے کہ تیری شوخی اور شرارت کی بدولت مجھے یہ دن دیکھنا پڑے گا ۔ جا اب کالے ناگ کے پاس جا اور اُس کے پاؤں میں اگر کوئی کانٹا چُبھ گیا ہو تو نکال ڈال ورنہ پیٹرسن صاحب تجھے ضرور ہی ہاتھیوں کا کھوج لگانے پر مامور کر دے گا ۔"

اس کے بعد چند دن ہاتھیوں کے جمع کرنے اور نو گرفتار شدہ جنگلی ہاتھیوں کو دو سدھے ہوئے ہاتھیوں کے درمیان چلانے میں گذرے تاکہ وہ میدانوں کی طرف کوچ کرنے وقت زیادہ تکلیف نہ دیں ۔ پیٹرسن صاحب اپنی ہوشیار اور سدھی ہوئی ہتھنی پدمنی پر سوار ہو کر ان جنگلی ہاتھیوں کو جو حال میں پکڑے گئے تھے دیکھنے آیا ۔ ایک درخت کے نیچے پیٹرسن صاحب کا دیسی محرر میز لگائے فیلبانوں کو تنخواہ تقسیم کرنے بیٹھا تھا ۔ یہ لوگ ایک ایک کرکے آتے اور اپنی تنخواہ لیکر اپنے اپنے ہاتھی کی طرف جو ایک قطار میں روانگی کی غرض سے تیار کھڑے تھے چلے جاتے ۔ اتوریا بھی تومائی کو ساتھ لئے محرر کی طرف اپنی تنخواہ لینے بڑھا ۔ اس وقت مچھوا پا نامی میر شکاری نے دبی آواز میں ایک دوست سے کہا " یہ لونڈا فیلگیری کے فن میں بڑا ہو کر سب پر سبقت لیجائیگا ۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ۔ ابھی اگلے دن کا ذکر ہے کہ اس نے اس چھوٹے سے سن میں وہ بہادری کر دکھائی کہ بڑوں بڑوں کو مات کر دیا ۔ افسوس کا مقام ہے کہ اس نئے جنگلی مرغ کو میدانوں میں پر جھاڑنے کے لئے بھیجدیا جائے ۔"

پیٹرسن صاحب نے جس کے کان ہر طرف لگے رہتے تھے اس ...

سُن پایا اور کہا۔ چھوا اپا یہ تو کس کا ذکر کر رہا ہے میری دانست میں تو میدان کے فیلبانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو زندہ تو کیا مُردہ ہاتھی کے پاؤں میں کمند ڈال سکتا ہو۔"

چھوا اپا نے جواب دیا "جی حضور میں ایک چھوٹے سے لڑکے کا ذکر کر رہا ہوں پچھلے ہانکے میں اُس نے نہایت بہادری سے لکڑ کوٹ کے اندر اُتر کر ایک ہاتھی کے پیچھے کو رستے سے جکڑنے میں مدد دی تھی۔" یہ کہہ کر چھوا اپا نے انگلی سے تومائی کی طرف اشارہ کیا اور پیٹرسن صاحب نے اُس کی طرف نظر بھر کر دیکھا اور تعجب سے کہا۔

"اس نے رسّا پھینکا تھا؟ ٹانگ برابر تو یہ خود ہے۔ اس سے ایسا بڑا کام کیسے ہوا؟ میاں چھوکرے تمہارا کیا نام ہے؟"

تومائی نے جُھک کر سلام کیا مگر پیٹرسن صاحب کا اُس پر کچھ ایسا رعب چھا گیا تھا کہ اول اول اُس کے مُنہ سے بات نہ نکلی۔ لیکن کالا ناگ اُس کے پیچھے کھڑا تھا اس لئے اُسے ڈھارس بندھی اور اُس نے اپنے ہاتھ سے ہاتھی کو کچھ اشارہ کیا۔ ہاتھی نے اُسے اپنی سونڈ پر بٹھا کر پدمنی کے مستک کے برابر لا کر پیٹرسن صاحب کے سامنے کر دیا۔

پیٹرسن صاحب یہ دیکھ کر ہنس پڑا اور بولا "لڑکے میاں تم نے ہاتھی کو یہ کرتب تو خوب سکھایا۔ مگر شاید تمہارا اس سے یہ مقصد ہے کہ جب لوگ گیہوں کی بالیں کوٹھوں پر سوکھنے کے لئے ڈالا کریں تو ہاتھی تمہیں اسی طرح اُٹھایا کرے اور تم بالیں چُرا لیا کرو۔"

تومائی نے جواب میں کہا "غریب پرور اناج کے بجائے اگر خربوزے ہوں تو مضائقہ نہیں۔" تومائی کی اس حاضر جوابی پر پیٹرسن صاحب بہت خوش ہوا اور فیلبانوں نے جو ہر طرف کھڑے تھے قہقہہ لگایا کیونکہ اُنہوں نے بھی لڑکپن میں اپنے ہاتھیوں کو یہ کرتب سکھایا تھا۔ اس وقت اتوریا ہاتھی پر بل ڈال کر بولا "صاحب یہ میرا بیٹا تومائی ہے۔ یہ نہایت شریر اور خراب ہے۔ بڑا ہو کر جیل خانہ میں دن گذارے گا۔"

پیٹرسن صاحب نے یہ سُن کر کہا "مجھے تو ایسا گمان نہیں۔ اُس کی عمر کا جو لڑکا جنگلی ہاتھیوں

کے مقابلہ سے نہ ڈرے اُس کا خاتمہ جیل خانہ میں نہیں ہوا کرتا۔ لڑکے میاں یہ لو یہ چونی۔ اس کی جا کر مٹھائی کھانا۔ یہ انعام تم کو اس لئے دیا جاتا ہے کہ تم ہوشیار رہو۔ ممکن ہے کہ بڑے ہو کر تمہیں بھی ہاتھی پکڑنے کی خدمت سونپی جائے" (یہ سن کر اتوریا نے اور بھی زیادہ تیوری چڑھائی اور تومائی کی طرف قہر آلود نگاہ سے دیکھا) "لیکن یاد رکھو کہ چھوٹے لڑکوں کو نہیں چاہئے کہ لکڑ کوٹ کے اندر کھیلنے کے لئے چلے جایا کریں"۔

تومائی نے ہانپ کر پوچھا "کیوں صاحب میں اُسکے اندر کبھی بھی نہ جاؤں" ؟

پیٹرسن صاحب نے مسکرا کر جواب دیا "ہاں اُس وقت تم کو اجازت دی جائے گی جب تم ہاتھیوں کا ناچ دیکھ لوگے۔ جب تم ہاتھیوں کو ناچتے ہوئے دیکھ لو تو میرے پاس آنا اور میں تمام لکڑ کوٹوں کے اندر داخل ہونے کی تم کو اجازت دوں گا"۔

اس بات پر ایک اور قہقہہ پڑا کیونکہ ہاتھی پکڑنے والوں کی اصطلاح میں ہاتھیوں کا ناچ دیکھنے کے معنی یہ ہیں کہ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ جنگلوں میں بعض صاف اور سطح قطعے چھپے ہوئے ہوتے ہیں جو ہاتھیوں کی رقص گاہ کہلاتے ہیں لیکن یہ بھی اتفاق سے ہی کسی کے دیکھنے میں آتے ہیں اور ہاتھیوں کو ناچتے ہوئے تو کسی شخص نے کبھی نہیں دیکھا۔ جب کوئی فیلبان اپنی بہادری اور ہنروری کا ذکر شیخی کے ساتھ کرتا ہے تو دوسرے فیلبان طنز کی راہ سے اُس سے کہتے ہیں "اور تو نے ہاتھیوں کا ناچ کب دیکھا تھا؟"

کالے ناگ نے تومائی کو اُس وقت نیچے اُتار دیا اور وہ پیٹرسن صاحب کو دوبارہ جھک کر سلام کرنے کے بعد سیدھا اپنی ماں کے پاس دوڑا ہوا گیا اور نہایت خوشی اور فخر سے اُس نے وہ چونی جو اُس کو بطور انعام کے ملی تھی اپنی ماں کے ہاتھ میں رکھی۔ پھر یہ سب کالے ناگ کی پیٹھ پر سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہوئے۔ نئے ہاتھیوں کی چیخ چنگھاڑ نے کوچ کا لطف دوبالا کر دیا۔ ہر ایک نالے کو عبور کرتے وقت ان نئے ہاتھیوں کی وجہ سے بڑی تکلیف ہوتی تھی اور اُنہیں قدم قدم پر چمکار پچکار کر یا مار کر آگے بڑھانا پڑتا تھا۔

اتوریا کے غصہ کی کوئی حد نہ تھی اور وہ تومائی پر رہ رہ کر دانت پیستا تھا لیکن تومائی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ پیٹرسن صاحب نے اُس کی طرف متوجہ ہو کر اُس سے باتیں کی تھیں اور اُس کو انعام دیا تھا۔ اور اس لئے اُس کے دل کی اُس وقت وہی کیفیت ہو رہی تھی جو ایک سپاہی کی ہوتی ہے جسے اُس کا سپہ سالار صف میں سے بُلا کر اُسکی تعریف کرے۔

آخر کار تومائی نے چپکے سے اپنی ماں سے پوچھا "اماں ہاتھیوں کے ناچ سے پیٹرسن صاحب کا کیا مطلب تھا؟"

اتوریا نے اُس کا یہ سوال سُن لیا اور اُس نے بھیڑیے کی طرح غرا کر یہ جواب دیا "ابے احمق اس کے یہ معنی ہیں کہ ہاتھی پکڑنے کی خدمت کبھی تیرے سپرد نہ کی جائے گی۔ ارے یہ آگے کس نے راستہ روک دیا ہے۔"

ایک آسامی فیلبان نے جو بمقدار دو یا تین ہاتھیوں کے فاصلہ کے آگے تھا پلٹ کر خفگی کے لہجہ میں کہا "کالے ناگ کو آگے لاکر میرے اس پاٹھے کی ذرا مرمت کر دے ایسا اڑ گیا ہے کہ بڑھتا ہی نہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں پیٹرسن صاحب نے مجھے بھی تم وہاں کے کھیت کے گنواروں کے ساتھ میدانوں میں بھیجنا پسند کیا۔ اتوریا اپنے ہاتھی کو میرے ہاتھی کے برابر لا تاکہ وہ اُسے اپنے دانتوں سے سیدھے راستے پر لائے۔ قسم ہے مجھ کو اپنے دیوتاؤں کی کہ یا تو ان نئے ہاتھیوں کے سر بھوت سوار ہے اور یا انہیں اپنے جنگل کے رفیقوں کی بُو آ گئی ہے۔"

غرضکہ کالے ناگ نے بڑھ کر اڑنے والے نئے ہاتھی کے پسلی میں اس زور سے دانت مارے کہ وہ تلملا گیا۔ اور اتوریا نے کہا "پچھلے ہانکے میں ہم نے بن کو تمام جنگلی ہاتھیوں سے خالی کر دیا اور جتنے ہاتھی تھے سب کو پکڑ لیا۔ ہاتھی صرف اس لئے اڑ رہے ہیں کہ تم کو ہانکنا نہیں آتا۔ اب کیا میں پوری قطار بھر میں کالے ناگ کو لیجا لیجا کر ہر ایک اڑیل ہاتھی کا بل نکالا کرونگا۔"

اس پر دوسرے فیلبان نے طنز کی راہ سے کہا "اس کی باتیں تو سنو۔ کہتا ہے کہ ہم نے بن کو تمام جنگلی ہاتھیوں سے خالی کر دیا۔ واہ واہ! کیا کہنے ہیں تم میدانیوں کی دانائی اور جزرسی کے! سوائے ایک گوڈر بھرے دماغ کے شخص کے جس کو جنگل دیکھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا ہو اور کوئی ایسا نہ ہوگا جسے یہ بات معلوم نہ ہو کہ وہ جانتے ہیں کہ اس موسم کا ہانکا ختم ہو گیا ہے اور اس لئے تمام جنگلی ہاتھی آج کی رات .... مگر میں کیوں بھینس کے آگے بین بجاؤں"

تومائی نے پکار کر پوچھا "آج کی رات وہ کیا کریں گے۔؟"

فیلبان نے جواب دیا "چھوکرے کیا تو بھی یہاں ہے؟ اچھا میں تجھے بتائے دیتا ہوں کیونکہ تیرے سر میں گوڈر نہیں بھرا ہے جنگلی ہاتھی آج کی رات ناچیں گے اور اس لئے تیرے باپ پر جس نے تمام بن کو تمام ہاتھیوں سے خالی کر دیا ہے لازم ہے کہ میخوں کو آج کی رات خوب مضبوط ٹھونک رکھے اور اپنے ہاتھی کے پاؤں میں دُہری زنجیر ڈالے"

یہ سن کر اتوریا بولا "یہ کیا مہمل گفتگو ہے؟ چالیس سال سے ہمارے خاندان میں بھی فیلبانی کی خدمت چلی آتی ہے لیکن ہم نے آج تک ہاتھیوں کے ناچ کا حال نہیں سنا"

فیلبان نے کہا "تم میدانوں میں رہنے والے جنہیں اپنے جھونپڑے کی چار دیواری کے علاوہ اور کسی چیز کا حال معلوم نہیں ہاتھیوں کا ناچ کیا جانو لیکن اتنا میں کہے دیتا ہوں کہ آج رات تو اپنے ہاتھیوں کو کھلا چھوڑ اور پھر دیکھ کیا تماشا ہوتا ہے اور ہاتھیوں کے ناچنے پر جو تو نے اعتراض کیا ہے سو میں نے خود وہ جگہ دیکھی ہے۔ ارے سامنے ایک گہرا نالہ آ گیا اور ہمیں پاٹھوں کو اس میں سے تیر کر لے جانا پڑے گا۔ تم پیچھے کھڑے رہو"

غرضکہ مہاوت آپس میں اس طرح کی باتیں کرتے منزلیں طے کرتے چلے۔ دن ڈھلنے کے قریب انہوں نے جنگل میں ایک جگہ قیام کیا۔ ہاتھیوں کے پچھلے پاؤں میں زنجیریں ڈال کر انہیں بڑی بڑی میخوں سے باندھ دیا گیا اور نئے ہاتھیوں کو بہ نظر مزید احتیاط دُہرے رسوں سے باندھا گیا اور ان کے آگے چارے کے ڈھیر رکھ دئے گئے۔ اس کے بعد

پہاڑی فیلبانوں نے میدانی فیلبانوں سے کہا کہ آج رات زیادہ احتیاط رکھنا اور جب میدانی فیلبانوں نے اس کی وجہ پوچھی تو وہ کھلکھلا کر ہنس دئے"

کیمپ میں شام کے وقت عجیب لطف تھا۔ مہاوتوں کی عورتیں کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ چولہوں پر ہر طرف ہانڈیاں چڑھی ہوئی نظر آتی تھیں اور درختوں کے نیچے تھوڑی تھوڑی سی دور پر آگ کا روشن ہونا بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ دور سے دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا بڑے بڑے جگنو ہیں کہ درختوں میں چمک رہے ہیں۔ مرد ہنسی مذاق میں مصروف تھے اور بچے کھیل رہے تھے۔ کچھ کچھ دیر کے بعد نئے ہاتھی چنگھاڑ اُٹھتے تھے اور مہاوتوں کے چمکارنے پچکارنے پر پھر چپ ہو جاتے تھے۔ غرضکہ اُس وقت عجب چہل پہل تھی اور ایسا سماں تھا کہ ایک دفعہ دیکھ کر اُسے فراموش نہیں کرسکتے تھے۔

نو عمر تومائی کھانا کھا کر کالے ناگ کے قریب اُس کے چارہ کے ڈھیر پر پڑ کر سو گیا آخر کار ہاتھی بھی اپنی عادت کے موافق ایک ایک کر کے لیٹنا شروع ہوئے حتیٰ کہ قطار کے داہنے سرے پر صرف کالا ناگ کھڑا رہ گیا۔ وہ ادھر سے اُدھر جھول رہا تھا۔ اور اپنے پنکھے کے سے کان اُس نے آگے بڑھا رکھے تھے تاکہ آہستہ آہستہ چلنے والی ہوا جو پہاڑیوں میں سنسنا رہی تھی اگر کسی صدا کا پیغام لائے تو اُسے سُن سکے۔

تومائی کچھ دیر تک سوتا رہا اور جب اُس کی آنکھ کھلی تو چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور کالا ناگ ابھی تک کان کھڑے کئے ہوئے کھڑا تھا۔ تومائی چارہ پر لیٹا ہوا دیو ہیکل ہاتھی کی پیٹھ کی محراب کو آسمان کے آدھے تاروں کے مقابل میں جھولتا ہوا دیکھتا رہا اور جب وہ یہ تماشا دیکھ رہا تھا تو دور دراز سے ایک نہایت خفیف صدا کسی جنگلی ہاتھی کے پکارنے کی اُس نے سُنی۔ اس آواز کا کان میں پڑنا تھا کہ تمام ہاتھی دفعتہً سطح سے ایک ساتھ اُچھل پڑے گویا کہ اُنہیں گولی لگی اور اُنہوں نے اتنا شور و غل مچایا کہ آخر کار مہاوت سوتے سے جاگ پڑے اور اُنہوں نے آکر میخوں کو اور زیادہ ٹھونک دیا اور رسّوں کو خوب مضبوط گرہیں دیدیں

یہاں تک کہ کچھ دیر میں پھر خاموشی چھاگئی۔ایک نئے ہاتھی نے اپنے کھونٹے کو قریب قریب بالکل اُکھیڑ ڈالا تھا۔اس لئے اتوریا نے کالے ناگ کے پچھلے پاؤں کی زنجیر کھول کر اُس ہاتھی کے اگلے اور پچھلے پاؤں میں عقال کے طور پر ڈالدی اور کالے ناگ کی ٹانگ کو ناریل کے ریشہ کی ایک رسّی سے باندھ کر اُس سے کہہ دیا کہ یاد رکھیو تو خوب مضبوط بندھا ہوا ہے۔ اتوریا خوب جانتا تھا کہ اُس کے باپ اور اُس کے دادا نے سینکڑوں مرتبہ یہی عمل کیا تھا اور کالا ناگ کبھی رسّی تڑا کر نہیں بھاگا تھا اور اس لئے اُسکو کالے ناگ کی طرف سے پورا اطمینان تھا۔رسّی سے باندھے جانے کے وقت جب کالے ناگ سے یہ بات کہی جاتی تھی کہ یاد رکھیو تو خوب مضبوط بندھا ہوا ہے تو وہ اُس کا جواب ایک تلقل کی سی آواز سے دیتا تھا۔لیکن آج رات اُس نے کچھ جواب نہیں دیا بلکہ چُپ چاپ کھڑا ہوا اپنا سر اُٹھائے اور اپنے کانوں کو پنکھوں کی طرح پھیلائے گارو کے کوہستان کی طرف چاندنی میں دیکھتا رہا۔

اتوریا نے تومائی سے کہا کہ اگر ہاتھی رات کو بیقراری ظاہر کرے تو اُس کی خبرگیری کیجیو یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور لمبی تان کر سو گیا۔تومائی کی آنکھ بھی لگنے ہی کو تھی کہ اُس نے ناریل کی رسّی کے تڑسے ٹوٹنے کی آواز سُنی اور دیکھا کہ کالا ناگ آہستہ آہستہ دبے پاؤں تھان سے اُسی طرح نکلا جا رہا ہے جس طرح ابر سیہ وادی کے منہ سے جھومتا ہوا نکلتا ہو۔تومائی بھی اُٹھ کر چاندنی میں ننگے پاؤں اُس کے پیچھے ہولیا اور دبی آواز میں کہنے لگا ”کالے ناگ! کالے ناگ! مجھے بھی اپنے ساتھ لیچل“ یہ سُن کر ہاتھی آواز کئے بغیر پیچھے پلٹا اور لڑکے کی طرف دو چار لمبی لمبی ڈگیں بھر کر اُسے سونڈ سے اوپر اُٹھا لیا اور اپنی گردن پر بٹھا کر جنگل کی طرف چل دیا۔

اس وقت دوسرے ہاتھیوں کے زور زور سے چنگھاڑنے کا شور بلند ہوا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ اپنی زنجیریں تڑا کر بھاگ جانے کی کوشش کر رہے ہیں مگر

کچھ دیر کے بعد یہ شور فرو ہو گیا اور کالے ناگ نے جلد جلد قدم بڑھانے شروع کئے۔
بعض دفعہ لمبی لمبی گھاس اُس کے پہلوؤں سے اُسی طرح لگتی جس طرح سمندر کی موج
جہاز سے لگتی ہے اور بعض دفعہ کانٹے دار بیلیں اُس کی پیٹھ کو کھرچتیں یا اُس کے کندھوں
کی رگڑ سے کوئی بانس چٹختا۔ لیکن اس اثنا میں کالا ناگ دبے پاؤں چپ چاپ چلا گیا اور
گاڑھے گھنے جنگل میں اس طرح بڑھا چلا گیا گویا کہ وہ دھوئیں میں سے جا رہا تھا۔ وہ پہاڑی
کی چڑھائی چڑھ رہا تھا اور گو تومائی کو درختوں کی درزوں میں سے ستارے برابر نظر آ رہے
تھے۔ لیکن اُسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کس سمت میں جا رہا ہے۔ آخرکار کالا ناگ پہاڑی
کی چوٹی پر پہنچ گیا اور ایک لمحہ کے لئے وہاں رُکا۔ تومائی نے سر اُٹھا کر دیکھا کہ میلوں
تک درخت ہی درخت چلے گئے ہیں اور وادی میں ایک دریا بہ رہا ہے جسے نیل گوں
سفیدی مائل دُھند نے چھپا رکھا ہے اور جنگل کے جانور بیدار ہو کر چاروں طرف تگ
ودو کر رہے ہیں۔ ایک بڑا میوے کھانے والا چمگادڑ اپنے پر پھڑپھڑاتا ہوا اُس کے
کان کے پاس سے ہو کر نکلا۔ جھاڑی سے ایک خارپشت کے تکلوں کے کھڑکھڑ
کرنے کی آواز آئی اور درختوں کے تنوں میں اُس نے ایک جنگلی سور کو گیلی مٹی کھودتے
اور سونگھتے دیکھا۔ اس وقت پھر درختوں کی شاخوں نے اُس کے سر کو چھپا لیا۔ اور کالے
ناگ نے اب پہلی مرتبہ بہ سرعت تمام اتار پر جھپٹنا شروع کیا۔ اُس کے پاؤں کے نیچے
جھاڑیوں کے روندے جانے سے کرچ کرچ کے پھٹنے کی سی آواز پیدا ہوتی تھی۔ اپنے
زبردست کندھوں سے وہ جن شاخوں کو دائیں بائیں ہٹاتا جاتا تھا وہ کمان کی طرح
دُہری ہو کر اُس کے پہلوؤں پر آ کر تڑ تڑ لگتی تھیں اور اپنا رستہ صاف کرنے کے لئے
جب وہ سر کو اِدھر اُدھر پھیرتا تھا تو انواع واقسام کی بیلیں اُس کے دانتوں میں اٹک کر
رہ جاتی تھیں۔ یہ حالت دیکھ کر ننھا تومائی دبک کر ہاتھی کی گردن کے ساتھ چمٹ گیا
تا کہ کہیں کوئی جھولتی ہوئی شاخ اُسے نیچے ہی نہ گرا دے اور اُس وقت اُس کی یہی تمنا

تھی کہ کاش میں نیلخانے میں کالے ناگ کے چارہ کے ڈھیر پر مزے سے پڑکر سویا ہوا ہوتا۔ گھاس اب روندی ہوئی آنے لگی یہاں تک کہ کالے ناگ کے پاؤں سبزہ کے عرق سے لت پت ہو گئے۔ سردی بھی زیادہ محسوس ہونے لگی اور تومائی کے دانت بجنے لگے۔ کچھ دور چل کر دریا آیا اور کالا ناگ اس میں اتر کر ہر ایک قدم تول کر رکھتا ہوا پار اترنے کے لئے بڑھا۔ اتنے میں دوسرے ہاتھیوں کے بھی ندی پار اترنے کی آوازیں آنی شروع ہوئیں اور ان کے چیخنے اور چنگھاڑنے کی صداؤں سے تھوڑی دیر میں جنگل گونج اٹھا اور تومائی کی نظروں کے سامنے دور تک بڑے بڑے سیاہ سائے پھیلنے لگے۔ یہ دیکھ کر وہ بولا "اہا ہا ہا! آج رات ہاتھی باہر نکلے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناچ کی رات ہے۔"

کالا ناگ پانی میں سے نکلا اور ایک دوسری چڑھائی چڑھنے لگا۔ لیکن اس دفعہ وہ اکیلا نہیں تھا اور نہ اسے اپنے لئے راستہ تیار کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ دو گز چوڑا راستہ پہلے سے کٹا کٹایا اس کے سامنے تیار تھا جس پر جنگل کی گھاس چوپاؤں میں روندے جانے کے باعث جھک گئی تھی پھر سر اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس راستہ سے چند ہی منٹ پہلے بہت سے ہاتھی گذرے ہوں گے تومائی نے پلٹ کر دیکھا تو ایک بہت بڑے لمبے لمبے دانتوں والے جنگلی ہاتھی کو جسکی تاراسی آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں دریا کے دھندلکے میں سے نکلتا دیکھا۔ اس کے بعد درختوں کی شاخوں سے اس کا سر چھپ گیا اور وہ آگے بڑھے چلے گئے۔ ہاتھیوں کے چنگھاڑنے شاخوں کے ٹوٹنے اور جھاڑوں جھنکاڑوں کے کھڑکھڑانے کی آوازیں انہیں چاروں طرف سے سنائی دینے لگیں۔ کالا ناگ عین پہاڑی کی چوٹی پر خاموش ہو کر دو درختوں کے تنوں کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ یہ درخت ان درختوں کے ایک حلقہ سے تعلق رکھتے تھے جو ایک کھلی ہوئی جگہ کے گرداگرد جو

چھ یا سات بیگھے ہوگی اُگے ہوئے تھے تومائی نے دیکھا کہ یہ جگہ کٹ گرانیٹ کے فرش کی طرح سخت ہو رہی ہے۔ اس کے وسط میں کچھ درخت بھی تھے مگر اُن کے تنے کی چھال گھس جانے سے نیچے کی سفید لکڑی نکل آئی تھی اور چاندنی میں آب و تاب کے ساتھ چمک رہی تھی۔ اس جگہ میں سبزہ نام کو نہ تھا صرف کٹی ہوئی مٹی تھی جس کی رنگت چاندنی میں لوہے کی سی نظر آتی تھی البتہ جہاں جہاں اسیر ہاتھی کھڑے تھے وہاں اُن کے سایہ کا رنگ روشنائی کی طرح سیاہ تھا۔ تومائی نے سانس روک کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا تو کھُلی ہوئی جگہ کے گرد جو درخت حلقہ زن تھے اُن کے تنوں میں سے اور بہت سے ہاتھیوں کو آتے دیکھا۔ ننھا تومائی صرف دس تک گن سکتا تھا اِسلئے اُس نے اپنی اُنگلیوں پر بار بار ان ہاتھیوں کو گننا شروع کیا یہاں تک کہ جتنی دہائیاں وہ گن چکا تھا وہ سب بھُول گیا اور اُس کا سر چکرانے لگا۔

اس میدان میں سفید دانتوں والے جنگلی نر جن کی گردنوں اور کانوں کے اُن حصوں میں جہاں جھول تھے پتے اور اخروٹ اور ٹہنیاں پڑی ہوئی تھیں۔ موٹی سُست رفتار ہتنیاں جن کے پیٹ تلے اُن کے گلابی رنگ کے سیاہی مائل بچے قد میں صرف سوا گز کے دوڑتے پھرتے تھے۔ نوخیز ہاتھی جن کے دانت ابھی دکھائی دینے ہی لگے تھے اور جن پر انہیں بڑا ناز تھا ڈھیلے پوست کی دُبلی پوپلے مُنہ کی بڈھی ہتنیاں جن کے ماتھے پر تفکر اور تردد کے آثار نمایاں تھے۔ بڈھے تجربہ کار ہاتھی جن کے چہروں پر وحشیانہ پن برستا تھا۔ جن کے جسموں پر گذرے ہوئے زمانہ کی لڑائیوں کے نشان نظر آرہے تھے اور جن کے پہلوؤں سے کیچڑ کے حمام کی جمی ہوئی مٹی خشک ہو ہو کر جھڑ رہی تھی۔ غرضکہ سبھی قسم کے ہاتھی موجود تھے ایک ہاتھی ایسا بھی تھا جسکا ایک دانت ٹوٹا ہوا تھا اور جسکے پہلو پر ایک شیر کے خوفناک چنگال کی گھسیٹ کا نشان پڑا ہوا تھا۔ انمیں سے کچھ تو اس میدان میں سر جوڑ کر کھڑے تھے۔ کچھ جوڑیوں میں اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے اور کچھ اکیلے کھڑے ہوئے مستی از خود رفتگی کی حالت میں جھوم رہے تھے تومائی کو

خوب معلوم تھا کہ جبتک میں کالے ناگ کی گردن پر چپ چاپ بیٹھا رہوں گا اُس وقت تک مجھے کسی بات کا کھٹکا نہ ہوگا۔ کیونکہ لٹکر کوٹ کے خوفناک ہانکے کی حالت میں بھی کوئی جنگلی ہاتھی اپنی سونڈ اُٹھا کر سدھائے ہوئے ہاتھی کی گردن سے آدمی کو اُتار لینے کی کوشش نہیں کرتا اور اس رات تو ہاتھیوں کی محفل کسی اور ہی مقصد سے برپا ہوئی تھی اُسوقت اُنہیں بھلا آدمیوں کا خیال کہاں تھا۔ ایک دفعہ البتہ اُنہوں نے جنگل کی طرف سے زنجیر کے بجنے کی آواز سن کر کان کھڑے کئے اور سب کے سب سر اُٹھا کر اُدھر دیکھنے لگے مگر یہ پیٹرسن صاحب کی چہیتی ہتنی پدمنی کی آواز تھی جو اپنے پاؤں کی ٹوٹی ہوئی زنجیر کو کھڑکھڑاتی ہوئی خرّاٹے لیتی پہاڑی پر چڑھ کر اپنے ہم قوموں کے جلسہ میں آداخل ہوئی۔ ضرور ہے کہ وہ اپنی زنجیر تڑا کر پیٹرسن صاحب کے کیمپ سے سیدھی اِدھر چلی آئی ہو۔ تومائی نے ایک اور ہاتھی کو بھی دیکھا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔ اس ہاتھی کی پیٹھ اور چھاتی پر رستے کے زخم کے گہرے نشان پڑے ہوئے تھے۔ اور ضرور ہے کہ وہ بھی قریب کے کسی پہاڑی کیمپ سے بھاگ کر اس بزمِ نشاط میں شریک ہونے کے لئے چلا آیا ہو۔

آخر کار جنگل کی طرف سے ہاتھیوں کے آنے کی آواز آنی موقوف ہوگئی۔ کالا ناگ درختوں میں سے جہاں وہ کھڑا ہوا تھا نکل کر مجمع کے وسط کی طرف خرخراتا اور غرغراتا ہوا بڑھا اور تمام ہاتھی اپنی بولی میں باتیں کرنے اور اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ تومائی دم بخود ہو کر کالے ناگ کی گردن سے ملا ہوا بیسیوں چوڑی پیٹھوں او ہلتے ہوئے کانوں اور اُچھلتی ہوئی سونڈوں اور گردش میں آتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے نظارہ میں محو تھا۔ کبھی کبھی دانتوں کے اتفاق سے آپس میں ٹکرا جانے کی آواز اُس کے کان میں پڑتی تھی اور سونڈوں کے باہم پیچ کھانے کی سرسراہٹ کندھوں اور پہلوؤں کے آپس میں رگڑ لگنے کی کھڑکھڑاہٹ اور دُموں کی پیہم اور مسلسل کوڑے کی سی پھٹکار اُسے سُنائی دیتی تھی۔ اُس وقت بادل کے ایک ٹکڑے نے چاند کو چھپا لیا اور چاروں طرف تاریکی چھا گئی

مگر ہاتھیوں کا ایک دوسرے کو دھکیلنا اور اپنے گلوں سے قلقل کی سی آواز نکالنا بدستور جاری رہا۔ تومائی جانتا تھا کہ کالے ناگ کے چاروں طرف ہاتھی ہی ہاتھی ہیں اور اس لئے اُسے اِس مجمع میں سے نکالنے کی کوشش کرنا ایک فعل عبث ہے۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے دانتوں کو جو سردی کے مارے بج رہے تھے زور سے دبایا اور کانپنے لگا۔ لکر کوٹ میں کم از کم مشعلوں کی روشنی اور شور و غل تو ہوتا تھا مگر یہاں وہ بھی نہیں تھا۔ اور ایک دفعہ جب کسی دوسرے ہاتھی کی سونڈ اُس کے گھٹنے کو آ لگی تو وہ یہی سمجھا کہ اُس نے اب مجھکو نیچے پٹخا۔ اس کے بعد ایک ہاتھی زور سے چنگھاڑا اور دوسرے بھی اُس کے ساتھ مل کر چنگھاڑنے لگے اور یہ قیامت کا شور پانچ یا دس لحظوں تک رہا۔ درختوں پر جو شبنم جمع تھی وہ مینہ کے قطروں کی طرح اَن دیکھی پیٹھوں پر ٹپ ٹپ گرنی شروع ہوئی اور ایک مدہم سی بھنبھناتی ہوئی آواز اٹھی۔ اول اول تو تومائی نہیں پہچان سکا کہ یہ کیا آواز ہے مگر اس آواز نے بتدریج بڑھنا شروع کیا اور کالے ناگ نے پہلے اپنا آگے کا ایک پاؤں اور پھر دوسرا پاؤں اُٹھایا اور جس طرح سے ہتھوڑے کی ضرب سندان پر پڑتی ہے اسی طرح یکے بعد دیگرے اُنہیں دنادن زمین پر مارنا شروع کیا۔ تمام ہاتھی اب ایک ساتھ ملکر پاکوبی کرنے لگے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی غار کے مُنہ پر طبل جنگ بج رہا ہے۔ شبنم درختوں سے اتنی گری کہ ایک قطرہ بھی باقی نہ رہا۔ ہاتھیوں کے پاؤں کی دھمک سے زمین دہل رہی تھی اور زلزلہ کی سی کیفیت ہر طرف محسوس ہو رہی تھی بیچارے تومائی نے کانوں میں اُنگلیاں ڈال لیں کہ آواز نہ آنے پائے مگر سر سے لیکر پاؤں تک اُس کا جسم جھنا رہا تھا اور اس لئے ہاتھ کانوں پر دھرنا بیکار تھا۔ ایک یا دو دفعہ تومائی کو ایسا محسوس ہوا کہ کالا ناگ اور باقی کے ہاتھی چند قدم آگے بڑھ گئے ہیں اور اس وقت اُن کے پاؤں کے زمین پر پڑنے سے سبزہ کے پامال ہونے اور ہری بوٹیوں کے کچلے جانے کا شور بلند ہوتا تھا مگر ایک دو منٹ میں وہ اُلٹے پاؤں ناچتے ہوئے پہلی جگہہ پر آجاتے تھے اور سخت زمین پر ہی

اگلی سی دہمک پھر شروع ہوجاتی تہی۔ سوائے ایک دفعہ کے جب کہ ہاتھی کے دو یا تین چھوٹے چھوٹے بچوں نے چیخ ماری تومائی نے کسی ہاتھی کو پکارتے یا منہ سے کسی قسم کی آواز نکالتے نہیں سنا۔ لیکن بچوں کی چیخ نکلتے ہی ایک تھپڑ کے پڑنے کی سی آواز آئی اور تہوڑی سی کشمکش کے بعد پھر خاموشی چھاگئی اور وہی قدموں کی دہمک بدستور جاری ہوگئی پورے دو گھنٹہ تک یہ عجیب وغریب ناچ ناچا گیا ہوگا۔ تومائی کی حالت تکان کی شدت سے نہایت بُری ہورہی تہی اور اُس کا بند بند درد کررہا تھا لیکن بادشبگیر کے سونگھنے سے اُسے معلوم ہوگیا کہ پو پھٹنے کا وقت قریب ہے۔

آخرکار صبح وہانی پہاڑیوں کے پیچھے سے پیلی چادر اوڑھ کر نمودار ہوئی اور پہلی کرن کے ظاہر ہونے پر دہمک موقوف ہوگئی گویا کہ سفیدہ کا طلوع ایک حکم تھا کہ ہاتھی اپنا ناچ ختم کردیں۔ تومائی کا سر ابہی بھنا ہی رہا تھا اور اُس کے کانوں کا بجنا موقوف نہیں ہوا تہا کہ کالے ناگ اور پدمنی رستے کے نشان والے ہاتھی کے سوا اور سب ہاتھی دفعتہً غائب ہوگئے۔ کسی قسم کا شور اور کوئی آواز تومائی کو ایسی سنائی نہیں دی جس سے اُس کو معلوم ہوسکے کہ ہاتھی کدہر گئے ہیں ایسا معلوم ہوتا تہا کہ گویا زمین پھٹ گئی ہے اور سب اُس میں سما گئے ہیں۔ تومائی نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی لیکن اُسے کچھ نظر نہ آیا۔

شب بیداری اور تکان سے تومائی کی آنکھیں پتھرا رہی تہیں۔ آخر اُس نے اپنے ہاتھی سے کہا "کالے ناگ اب تو مجھے لیکر پدمنی کے ساتھ سیدہا پیٹرسن صاحب کی خیمہ گاہ کی طرف چل میں ایسا تھک رہا ہوں کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تیری گردن پر سے میں نہ گر پڑوں۔"

تیسرے ہاتھی نے اِن دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا اور رفراٹا بھر کر اُس نے اپنی راہ ایک دوسری سمت میں لی۔ غالباً وہ کسی راجہ کا ہاتھی تہا جو پچاس ساٹھ یا سو میل کے

فاصلہ پر سے اپنا تھان چھوڑکر یہاں آیا تھا۔

اس کے دو گھنٹہ بعد پیٹرسن صاحب اپنے کیمپ میں بیٹھا ہوا چھوٹی حاضری کھا رہا تھا کہ اُس کے ہاتھیوں نے جنہیں اُس رات دُہری زنجیروں میں جکڑ دیا گیا تھا چنگھاڑنا شروع کیا اور راستے میں بدمستی کندھوں تک کیچڑ میں لت پت کالے ناگ کے ساتھ جو لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا کیمپ میں آداخل ہوئی۔ تومائی کے چہرہ پر مُردنی چھا رہی تھی اور سردی کے مارے وہ اینٹھ رہا تھا۔ اُس کے بالوں میں پتے لپٹے ہوئے تھے اور شبنم اُن سے نچڑ رہی تھی۔ بہرحال اُس نے پیٹرسن صاحب کو سلام کرنے کی کوشش کی اور آہستہ سے یہ لفظ اُس کے مُنہ سے نکلے "ناچ! ہاتھیوں کا ناچ! میں نے دیکھ لیا! میں مرا" کالا ناگ زمین پر بیٹھا ہی تھا کہ وہ اُس کی گردن سے اُترا اور بیہوش ہو کر گر پڑا۔

کچھ دیر کے بعد جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے اپنے آپ کو پیٹرسن صاحب کے سفری پلنگ پر لیٹا ہوا پایا اور اُس کے قریب ایک تپائی پر ایک گلاس میں برانڈی اور کونین سے ملا ہوا کسی قدر گرم گرم دودھ رکھا تھا۔ جنگل کے بڈھے شکاری تین قطاروں میں اُس کے سامنے کھڑے تھے اور اُس کی طرف ایسے مؤدبانہ طور سے دیکھ رہے تھے کہ وہ گویا کسی دیوتا کا اوتار ہے بچے جس طرح اپنی سرگذشت سُنایا کرتے ہیں اُسی طرح تومائی نے بھی اپنا واقعہ مختصر الفاظ میں بیان کیا۔

"اگر میں جھوٹ کہتا ہوں تو تم جا کر دیکھ لو۔ ہاتھیوں کے ناچ کے میدان کی طرف بیسیوں پگڈنڈیاں جنہیں اُنہوں نے رات ہی میں پاؤں سے روند کر تیار کیا ہے تمکو جاتی ہوئی ملیں گی۔ میں نے اُن کا ناچ دیکھ لیا۔ کالا ناگ مجھے لے گیا تھا اور اُس نے یہ ناچ مجھکو دکھایا۔ کالا ناگ بھی بہت تھک گیا ہے۔"

یہ کہہ کر تومائی تو پھر سو گیا اور پیٹرسن صاحب اور مچھوا اپا ہاتھی اور ہتنی کے پاؤں کے کھوج کی رہنمائی سے پہاڑیوں میں برابر پندرہ میل تک چلے گئے۔ پیٹرسن صاحب نے

اٹھارہ سال جنگلی ہاتھیوں کے پکڑنے میں گذارے تھے اور اس سے پہلے صرف ایک دفعہ اُس نے اس قسم کی ہاتھیوں کے ناچنے کی جگہہ دیکھی تھی۔ مچھوا اپا نے پہاڑی کی چوٹی پہ اس کٹی ہوئی جگہہ کو دیکھتے ہی کہا۔

"بچے نے جو کچھ بیان کیا ہے اُس کا حرف حرف سچ ہے۔ ہاتھیوں کا پچھلی رات کو یہاں ناچنا ایسا ہی یقینی ہے جیسی کہ یہ بات کہ اس وقت دن ہے۔ دریا کے کنارے میں نے ستر کے قریب مختلف سمتوں میں جاتی ہوئی پگڈنڈیاں گنی ہیں۔ یہ دیکھئے صاحب سامنے کے درخت کی چھال پدمنی کے پاؤں کی زنجیر سے کٹ گئی ہے وہ بھی رات کو ضرور یہاں تھی۔ میں نے اپنی عمر کے پینتالیس سال انہیں ہاتھیوں میں گذارے ہیں۔ لیکن کبھی یہ بات میرے سننے میں نہیں آئی کہ جو کچھ اس انسان کے بچے نے دیکھا ہے وہ کسی اور انسان نے بھی دیکھا ہو۔"

جب وہ کیمپ کو واپس آئے تو شام کے کھانے کا وقت قریب تھا۔ پیٹرسن صاحب نے اپنے خیمہ میں اکیلے بیٹھ کر کھانا کھایا مگر اُس نے حکم دے دیا کہ اہالی کیمپ کو دو بھیڑیں اور کچھ مرغ اور آٹے نمک اور چاولوں کی دُگنی جنس دی جائے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کیمپ والے جلسہ کریں گے۔ اتوریا دوسرے کیمپ سے جو میدانوں میں واقع تھا اپنے بیٹے اور اپنے ہاتھی کی تلاش میں بھاگتا ہوا آیا اور جب ان دونوں کو اُس نے پالیا تو اس انداز سے اُس نے ان کی طرف دیکھا گویا کہ دونوں کی طرف سے اُس کے دل میں خوف تھا۔ غرضکہ رات کے وقت ہاتھیوں کے تھان کے آگے ایک بہت بڑا الاؤ روشن کیا گیا اور ایک خوشی کا جلسہ منایا گیا۔ اس جلسہ میں سب کی نظر جس پر پڑتی تھی وہ تومائی تھا۔ بڑے بڑے فیل گیر اور سراغ رساں اور فیلبان اور رسن انداز اور رائض جنہیں وحشی سے وحشی ہاتھی کے سدھانے کے گر معلوم تھے نہایت ادب اور تعظیم سے بار بار اس پر نظر ڈالتے تھے اور ہاتھوں ہاتھ اُسے لئے پھرتے تھے ایک جنگلی مرغ کو مار کر اس کے خون سے

توماٹی کے ماتھے پر انہوں نے ٹیکا لگایا تاکہ اُس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ جنگل کے رازداروں میں شریک کر لیا گیا ہے۔

آخر کار جب شعلے فرو ہو گئے اور سرخ انگاروں کے عکس سے ہاتھی بھی خون میں رنگے ہوئے معلوم ہونے لگے تو مچھوا اپا جو سب مہاوتوں کا سردار تھا اٹھا اور توماٹی کو اُس نے اپنے ہاتھوں میں اُٹھا کر اپنے سر سے بلند کیا اور پھر اس طرح بولا "اے بھائیو سنو اور اے ہاتھیو تم بھی سنو کیونکہ میں مچھوا اپا تم سے مخاطب ہوتا ہوں اس بچہ کو ہم فقط توماٹی ہی نہیں کہیں گے بلکہ اُس کا لقب **ہاتھیوں والا توماٹی** ہوگا۔ انسان نے جو بات آج تک رات کے وقت نہ دیکھی تھی وہ جنگل کے دیوتاؤں کی کرپا اور ہاتھیوں کی مہربانی سے اس بچہ نے دیکھی۔ میری بات تم آج سن رکھو کہ یہ بچہ ایک بڑا کھوجی ہوگا اور مجھ پر بھی سبقت لے جائے گا۔ نئے کھوج اور پرانے کھوج اور ملے ہوئے کھوج کا حال اُس کی تیز آنکھ پر یکساں روشن ہوگا۔

جب وہ لکڑ کوٹ میں جنگلی ہاتھیوں کی ٹانگوں میں انہیں رسّے سے جکڑنے کے لئے دوڑے گا تو اُسے کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ اور اگر حملہ آور ہاتھی کے آگے وہ پھسل کر گر پڑے گا تو ہاتھی جان جائے گا کہ وہ کون ہے اور اُسے اپنے پاؤں تلے نہیں کچلے گا" (ہاتھیوں سے مخاطب ہو کر) "اے زنجیر پوش سردارو دیکھ لو اس بچے کو جس نے پچھلی رات کو تمہاری پوشیدہ سے پوشیدہ جگہ میں تمہارا ناچ دیکھا اور جو بات آج تک کسی آدمی کے دیکھنے میں نہ آئی تھی وہ اس کے دیکھنے میں آئی۔ اے میرے بچو **ہاتھیوں والے توماٹی** کی عزت کرو اور اُسے سب مل کر سلام کرو۔ اے گنگا پرشاد! ہیرا گج! برچی گج! کٹار گج! اور اے پدمنی اور کالے ناگ تم سب کے سب ایک ساتھ سونڈ اُٹھا کر **ہاتھیوں والے توماٹی** کی سلامی اُتارو۔"

یہ سن کر تمام ہاتھیوں نے اپنی سونڈوں کو ایک ساتھ اُٹھایا۔ یہاں تک کہ ہر ایک

سونڈ ماتھے سے جا لگی اور پھر اُنھوں نے مل کر پورے زور سے ایک چنگھاڑ ماری اور وہ سلامی اُتاری جو صرف ہندوستان کے دسراے کے لئے اُتاری جاتی ہے۔

مگر یہ سب نوعمر تومائی کی خاطر تھی جس نے وہ بات دیکھی تھی جو پہلے کسی انسان کے دیکھنے میں نہیں آئی یعنے گاروکے بن کے بیچوں بیچ رات کے وقت ہاتھیوں کے ناچ کا تماشا ✤

مہادیو اور چیونٹی

یہ وہ گیت ہے جو تومائی کی ماں نے اپنے چھوٹے دودھ پیتے بچے کو سنایا

شنبھو کا ناج پکایا جس نے اور چلائی جس نے ہوا
گدی والے راجہ سے لیکر کملی والے منگتے تک
پرتھی کا کرتار ہے وہ اور سب کا پالنہار ہے وہ
بھوسا گائے کا اُسنے دیا اور اونٹ کو اُسنے جھاڑی دی
گیہوں دی دھن دان کو اُسنے اور کنگال کو کنگنی دی
چیتے کو اُسنے بکری دی اور چیل کو اُسنے بانٹا ماس
شنبھو کے برابر پاربتی بھی بیٹھی ہوئی تھی اور سب کو
بات یہ اُس کے جی میں آئی جل دوں میں اپنے بالم کو
بانٹ چکا جب کھانا سب کو شنبھو تو یہ اُس کی تریا نے
ہنس کر پاربتی کو شنبھو نے یہ اتار دیا۔ سب نے
کھول کے اپنی مٹھی پاربتی نے دیکھا چیونٹی کو
ڈر کے مارے وہ کانپ اُٹھی اور ڈنڈوت اُسنے کی شنبھو کو
پرتھی کا کرتار ہے وہ اور سب کا پالن ہار ہے وہ
بھوسا گائے کو اُسنے دیا اور اونٹ کو اُسنے جھاڑی دی

جگ کئی بیتے ہیں کہ وہ اک دن جگ کے دوار پہ بیٹھا تھا
بھاگ اپنی اپنی پر البدہ کا ہر اک کو اُس نے بانٹا
ہے پرمیشر سب کا وہ ہے سب کا وہ ہر سائیں اور داتا
بچہ گود میں دے کر اُسنے ماں کا کلیجہ کیا ٹھنڈا
اور منگتے کی جھولی میں بھی اُسنے ڈال دیا ٹکڑا
پاپی بھیڑیئے کو دی ہڈی سب کو دیا اُس نے کھانا
آتے جاتے دیکھ رہی تھی جبکہ بندھا تھا یہ تانتا
چیونٹی کو جھٹ اُس نے اُٹھا کر اپنی مٹھی میں گپت کیا
ہنس کے کہا سب کو تو رجایا ایک کو کیوں بھولا چھوٹا
پالیا اپنا اپنا بھاگ میں چیونٹی کو بھی نہیں بھولا
اور دبائے پایا اُسے مُنہ میں سرسوں کا اک دانہ
اُپتن جسنے کیا ہر جیو کو پیٹ جو بھرتا ہے سب کا
ہے پرمیشر سب کا وہ ہے سب کا وہ سائیں اور داتا
بچہ گود میں اُسنے دے کر ماں کا کلیجہ کیا ٹھنڈا

شکر کہ جہازہ بہ منزل رسید **تمام شد** زورق اندیشہ بہ ساحل رسید

یہ وہ قصیدہ ہی جو شنبہ کے روز بتاریخ ۶- اپریل سنہ ۱۹۰۱ء کیمپ لنگم پلی واقع ضلع وارنگل میں عالی جناب نواب سر وقار الامرا بہادر کے سی- آئی ای کے سامنے پڑھا گیا+

کچھہ عجب شان سے اس مرتبہ آئی ہے بہار
کہ گل ولالہ سے ہے دامن گلچیں گلنار

جس طرف دیکھئے سبزہ کی لگی ہے محفل
جس طرف دیکھئے ہے سنبل تر بادہ گسار

جس طرف جائیے گردش میں ہے جام ومینا
جس طرف سنئے عنادل کے ترانے ہیں ہزار

اثر نامیہ سے ہے غازۂ روئے گل تر
سبزہ کی زلف کا شانہ ہے صبا کی رفتار

لڑکھراتی ہوئی آئی ہے صبا مستانہ
خواب نوشیں سے ہوا ہے ابہی سبزہ بیدار

ناز کرتا ہے کہیں سرو سے میں بہتر ہوں
نسترن مجھکو کہاں پائے گی ہے دعوے خار

ہر طرف شاہد قدرت ہی نہیں جلوہ فروش
گرم انساں کا بہی ہے ایک طرف کو بازار

جشن برپا ہے بڑی دہوم سے اک جنگل میں
غلغلہ عیش کا ہے اور مسرت کی پکار

کس لئے آج مرتب ہے یہ بزم زیبا
کس لئے آج ہے یہ عیش وطرب کا اظہار

رشک صحن چمن آج ہے کیوں ساحت دشت
آج کس شخص کا جنگل میں لگا ہے دربار

کون سی بزم ہے یہ کون ہے اس کا ساقی
کون یہ قافلہ ہے کون ہے اس کا سالار

ہے یہ وہ بزم کہ ہر ذرہ ہے جس کا خورشید
ہے یہ وہ بزم کہ ہر مست ہے جس کا ہشیار

ہے یہ وہ بزم کہ دولت کو ہے جسپر نازش
ہے یہ وہ بزم کہ اقبال کو ہے جس سے وقار

ہے یہ وہ بزم کہ جس سے ہوا جنگل منگل
ہے یہ وہ بزم کہ جس سے ہوا صحرا گلزار

ہے یہ وہ بزم کہ فانوس ہے اسکا گردوں
ہے یہ وہ بزم کہ شمع اس کی ہے خورشید نثار

بزم جمشید کے قصے تو چلے آتے ہیں
مگر اس بزم طرب زا کی انوکھی ہے بہار

کیوں نہ اس بزم کو ہو فخر خود اپنے اوپر
ہے یہ وہ بزم کہ سرکار ہیں جس کے ساقی
داورِ ذی حشم و جاہ **وقار الامرا**
مہبطِ فضلِ خدا موردِ فیضِ یزداں
جن کا شیوہ ہے کرم لطف ہے آئیں جن کا
ہوئے پنجشنبہ کے دن بلدہ سے نہضت فرما
کیوں نہ تھک جائے شب و روز کی محنت سے دماغ
سر یہی ہے متقاضی کہ ملے کچھ تو فراغ
اک نہ اک وقت ہے تفریح و تفرج بھی ضرور
جمعہ کے روز ہوئے وارد لنگم پلی
خبر آئی یہ اسی روز ہوا ہے "گارا"
ابھی سورج نہ ڈھلا تھا کہ سواری نکلی
دیکھکر اس کی جھلک خیرہ ہوئی چشمِ فلک
رشک سے گرد ہوئی ابلقِ ایام کی چال
غرض اس شان سے پہنچے وہاں باجاہ و خدم
دامنِ کوہ میں کرتا تھا فلک سے باتیں
گود میں اپنی لئے تھا وہ مچان اک اونچا
نردباں اس پہ لگا کر ہوئے رونق افروز
شور اب دف کا ہوا لوگ لگے چلانے

جبکہ اس بزم کے ہیں باعثِ زینت سرکار
ہے یہ وہ قافلہ سرکار ہیں جس کے سالار
نیرِ برجِ شرف جن پہ سعادت ہے نثار
معدنِ لطف و کرم مخزنِ جود و ایثار
جن کا احساں ہے چلن اور مروت ہے شعار
اس ارادہ سے کہ چندے رہے سیر اور شکار
متصل کام سے کیسے نہ پڑے طبع پہ بار
دل یہی ہے متمنی کہ ملے کچھ تو قرار
اک نہ اک وقت ہے لازم رہے انساں بیکار
اُن کے قدموں سے بنا صفحۂ ہاموں گلزار
سن کے فرمانے لگے ہونگے ابھی ہم بھی سوار
فتح و نصرت ہوئے ہمراہ رکابِ سرکار
چھا گیا چہرۂ خورشید پہ بادل کا غبار
شوخیاں اپنی دکھاتی جو چلی لیل[1] و نہار
جہاں ضیغم کو یہ دعویٰ تھا کہ ہوں میں سردار
اک شجر جو کہ بلندی میں تھا رشکِ اشجار
جس کو خدام نے کر رکھا تھا پہلے سے تیار
اور دیا حکم کہ ہوں ہانکنے والے تیار
گونج اُٹھے غلغلہ سے دشت و جبل وادی و غار

[1] سرکار کی سواری کی ابلق مادیان کا نام ہے۔

چیختا تھا کوئی اور چرخی گھماتا تھا کوئی — خالی بندوق کا کرتا تھا ہوا میں کوئی وار
سُن کے یہ شور عجب کھلبلی جنگل میں پڑی — اُڑے طاؤس کہیں اور کہیں تیہو و سار
شورِ محشر کا جو ہنگامہ بپا تھا ہر سو — شیر گھبرا کے ہوا نیند سے آخر بیدار
غار سے وہ بصد اندازِ خراماں نکلا — جُھومتا جاتا تھا مستانہ تھی اُس کی رفتار
دامنِ کوہ میں جھاڑی سے نکل کر پہنچا — اور قضا نے کیا سرکار سے اُس کو دوچار
مطمئن ہو کے جو سرکار نے سر کی بندوق — اُس نے بھی آنکھ اُٹھا کر اُنہیں دیکھا اک بار
گولی بندوق سے نکلی تھی اجل کی داعی — ملک الموت مگر اُوجِ ہوا پر تھا سوار
جا کے پہلو میں لگی اور گرایا اُس کو — مثلِ پیکانِ قضا ہو گئی سینے کے پار
گرتا پڑتا وہ اُٹھا چند قدم اور چلا — پتھروں میں وہ چھپا جا کے میانِ کہسار
ملک الموت نے چھوڑا نہ وہاں بھی پہ اُسے — جان سرکار کے اقبال پہ کی اُس نے نثار
لوگ کہتے تھے یہی شیر ہے زندہ اب تک — زخم ہیں چند لگے پر نہیں کوئی پر کار
[1]روز ہے روز اگر اور اگر رات ہے رات — تو نہیں زندہ بچا شیر" یہ بولے سرکار
ہیں جو کپتان رسالہ کے وہ اور افضل خاں — ڈھونڈھنے اُسکو چلے ہاتھی پہ ہو کر کے سوار
غلغلہ چار طرف بن میں دوبارہ اُٹھا — شور ہر طرف کا مچا اور ہوئی ہانکے کی پکار
سر بنا دیں کہیں لچھمیا[1] و کشٹیا نے — نہ کہیں اُن کو سکوں تھا نہ کہیں آن کو قرار
شور اتنا ہوا لیکن نہ کراہا تک شیر — غُل ہوا اتنا مگر اُس نے نہ لی ایک ڈکار
پھر تو سب لوگ لگے فرطِ یقیں سے کہنے — کہ نہیں شیرِ ژیاں زندہ بچا ہے زنہار
واقعی مردہ وہ اک بھٹ میں ملا ڈھونڈھنے سے — قول سرکار کی تصدیق ہوئی آخر کار
ناز تھا اپنے نہتور پہ شجاعت پہ جسے — اُس کی جرأت کا نہ باقی رہا کوئی آثار

ل علاقۂ پائگاہ سرکار ممدوح الشان کے دو شکاریوں کے نام۔

الغرض کیمپ میں لائے اُسے باشوکت نشاں　　سبز شامیں خیمیں کھنچ اُس کا تو پتے تھے غرور

کھال کھینچی گئی اُس کی زہے پا بوسی　　رہ گیا اُس کی فقط ہڈیوں کا ایک انبار

عرض سرکار سے کی میں نے مبارک باشد　　یہ شکار اور شکار ایسے ہی شیروں کے ہزار

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

رہیں بادولت و اقبال سلامت سرکار

از ظفر علی خاں